ماہنامہ

ضیائے حدیث

لاہور

علمی | ادبی | تحقیقی | اصلاحی مجلّہ

دارالسلام
DARUSSALAM

دارالسلام کی تحقیق کا آئینہ دار

چیف ایڈیٹر
عبدالمالک مجاہد

جلد: 22 | شمارہ: 02 | فروری 2013ء/ربیع الثانی 1434ھ

مسئلہ کشمیر اور اظہارِ یکجہتی کشمیر

عملی تقاضے کب پورے ہوں گے؟

امریکہ اسلام آباد میں مضبوط حکمران نہیں دیکھنا چاہتا

خطے کی صورت حال کا بے لاگ تجزیہ

روس میں روشنی کے مینار

عبدالمالک مجاہد

حقیقی محبّت اور "ویلنٹائن ڈے" کی محبّت

- امریکہ آکر کایا پلٹ گئی
- کامیاب ازدواجی زندگی کے رہنما اصول

علمی | ادبی | تحقیقی | اصلاحی مجلہ

ماہنامہ

ضیائے حدیث

لاہور

جلد:22 | شمارہ:02 | فروری 2013ء/ربیع الثانی 1434ھ

چیف ایڈیٹر
عبدالمالک مجاہد • بیاد مولانا حکیم عبدالمجید سوہدروی رحمہ اللہ • بانی مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ

وسعتِ دامساں

عقائد — مشرکین عرب کا شرک — مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری — 23



تجلیات قرآن — باہمی قتل وغارت گری — حافظ محمد حق نواز — 8



ادبیات — ادب کے نام پر اخلاقی تباہ کاریاں — ابوفراز اصغر علی صابر — 56



روشنی کا سفر — بہن مریم — مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی — 75



ایگزیکٹو ایڈیٹر حافظ عبدالوحید سوہدروی ایڈیٹر محمد نعمان فاروقی
numanfaruqi@gmail.com

مجلس ادارت
مولانا ارشاد الحق اثری | پروفیسر محمد یحییٰ | حافظ عبدالستار حماد
حافظ صلاح الدین یوسف | حافظ شبیر صدیق | حافظ محمد حق نواز

مجلس مشاورت
چوہدری محمد یٰسین ظفر | ڈاکٹر محمد حماد لکھوی | مولانا محمد عبدالجبار
عکاشہ مجاہد

مجلس نظامت
حافظ عبدالعظیم اسد | قمر الحمید فیصل | عبدالغفار مجاہد
شیخ ارشد علی | محمد اعظم یٰسین | حافظ محمد ندیم

آرٹ اینڈ ڈیزائن: طارق جاوید عارفی | حافظ عثمان یوسف

محمد صفت الٰہی (آرٹ ڈائریکٹر) | ہارون الرشید (گرافک ڈیزائنر) | قانونی مشیر
خطاطی: اکرام الحق | کمپوزنگ: اظہر حنیف | ملک نور محمد سرفراز

ضیائے حدیث جاری کروانے کے لیے

منی آرڈر، آن لائن یا ایزی پیسہ کے ذریعے سالانہ زرتعاون دفتر ارسال کریں اور حسب ذیل نمبرز میں سے کسی ایک پر اطلاع دیں اور اپنا مکمل ایڈریس لکھوائیں۔ رسالہ آپ کے نام جاری ہو جائے گا۔

- منی آرڈر اور خط کتابت کے لیے:

دفتر ماہنامہ ''ضیائے حدیث'' 36 لوئر مال، لاہور (پاکستان)

- آن لائن کروانے کے لیے:

A/C Title: Monthly Zia-e-hadith
A/C No: 0038805201002063
M.C.B Bank Ltd. Session Court Branch
Lahore. Br Code: 1317

- برائے ایزی پیسہ:
موسیٰ علی: 0313 75 79 034
شناختی نمبر: 34101-4002586-9

سرکولیشن منیجر: محمد یوسف سلفی +92 300 70 71 823
شعبہ ترسیل: موسیٰ کلیم بلتستانی +92 313 75 79 034
Tel:+92 42 372 32 400 | Fax:+92 42 373 54 072
ziaehadith1@yahoo.com

ناشر محمد ادریس فاروقی مقام اشاعت 399/E اندرون موچی دروازہ، لاہور
پرنٹر انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس، 36۔لوئر مال، لاہور

اداریہ	شادی کا ایک ہی فنکشن ہو جائے تو؟	عبدالمالک مجاہد	7
انوار حدیث	مہمان نوازی	عبداللہ یوسف ذہبی	13
سیاسی منظرنامہ	امریکہ مضبوط حکمران نہیں دیکھنا چاہتا	محمد انیس الرحمٰن	17
افتاء و ارشاد	آپ کے مسائل اور ان کا حل	حافظ عبدالخالق	20
اشاعت حدیث	غیر معروف مگر صحیح یا حسن احادیث	ابوانس	30
تہذیب و تمدن	حقیقی محبت اور ویلنٹائن ڈے کی محبت	حافظ شبیر صدیق	31
معاشیات	تجارت میں اُتار چڑھاؤ اور حقیقی اسباب	حافظ عبدالسمیع	36
سیاسیات	مسئلہ کشمیر اور اظہارِ یکجہتی کشمیر	ارشاد احمد ارشد	40
مکتوب الریاض	روس میں روشنی کے مینار	عبدالمالک مجاہد	43
مکتوب امریکہ	امریکہ آ کر کایا پلٹ گئی	حافظ عبدالوحید سوہدروی	47
گوشۂ خواتین	کامیاب ازدواجی زندگی کے رہنما اصول	حنا امجد	53
تبصرۂ کتب	کتابوں کے دیس میں	ایڈیٹر	61
سیر و سوانح	امت مسلمہ کے خیر خواہ قاضی حسین احمد رحمہ اللہ	چیف ایڈیٹر	63
تہذیب و تمدن	عالمی یومِ محبت اور مسلمان	جویریہ منظور	66
عالم اسلام	عراق: دجلہ و فرات کی سرزمین	محسن فارانی	68

دیگر ممالک میں سالانہ زرتعاون: سعودی عرب 100 ریال | یورپی ممالک 30 یورو

قیمت فی شمارہ 35 روپے | سالانہ رعایتی زرتعاون: عام ڈاک مع -/400 روپے | رجسٹری ڈاک -/800 روپے

شادی کا ایک ہی فنکشن ہو جائے تو؟

آج میں اپنے قارئین کرام کے ساتھ زیر عنوان موضوع کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے ایک فلسطینی دوست ابو بسام اور سعودی دوست محمد المعتاز سے بھی کئی مرتبہ بات چیت کر چکا ہوں۔ ایک دن میں نے ابو بسام سے پوچھا کہ یہ جو شادی کے موقع پر ہم لوگ اتنا خرچ کرتے ہیں اور کم از کم دو فنکشن کرواتے ہیں، ایک لڑکی والوں کی طرف سے اور دوسرا لڑکے والوں کی طرف سے ہوتا ہے، کیا یہ ایک نہیں ہو سکتا؟

قارئین کرام! شادی خوشیوں اور سعادتوں کا نام ہے۔ دو خاندان آپس میں ملتے ہیں، ان میں قریبی تعلق پیدا ہوتا ہے اور پھر نکاح کے نتیجے میں ایک نیا گھرانہ وجود میں آتا ہے۔ مگر کتنے ہی گھرانے ایسے ہیں کہ ان سے جب شادی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ بیٹی یا بیٹے کی شادی کب کر رہے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ بس ہم تیاری کر رہے ہیں۔ فنکشن کے لیے ہمارے پاس فی الحال رقم جمع نہیں ہے۔ پھر وہ یا تو قرض اٹھاتے ہیں یا عزیز و اقارب سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔

''ابو بسام! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان دو فنکشنوں کی بجائے لڑکی اور لڑکے والے ملکر ایک ہی فنکشن کر لیں؟'' میں نے اس سے کہا۔ ابو بسام نے میری بات مکمل نہ ہونے دی اور میری بھرپور تائید کرتے ہوئے کہنے لگا کہ عرب معاشرے میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ کے ملک میں بھی ایسا ہو جائے تو بہت عمدہ اور بہتر ہوگا۔ اس سے کتنے ہی لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔

معزز قارئین! مجھے سعودی عرب میں رہتے ہوئے 32 سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران کتنی ہی سعودی شادیوں میں شرکت کا موقع ملا۔ آیئے تھوڑی دیر کے لیے ہم ان کی عادات اور ثقافت پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر ہم آگے بڑھتے ہیں۔ سعودی عرب میں بیٹی یا بیٹے کا رشتہ تلاش کرنے کے کم و بیش وہی طریقے ہیں جو ہمارے ملکوں میں رائج ہیں۔ جب رشتہ طے ہو جاتا ہے تو پھر مہر طے کیا جاتا ہے۔ عموماً سعودی عرب میں 30 ہزار سے 40 ہزار ریال مہر کی رقم ہے جو نکاح کے وقت دلہن کو ادا کر دی جاتی ہے۔ بعض امیر کبیر لوگ اس مبلغ سے زیادہ بھی ادا کرتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں اور اسی طرح بہت سارے قبائل میں اس سے کم مہر بھی پایا جاتا ہے مگر عرف عام میں اتنا ہی ہے۔ نکاح عموماً شادی کی تقریب سے پہلے کمرہ عدالت میں قاضی کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ بعض گھرانوں میں جتنا مہر ہوتا ہے شرفا اتنی رقم اپنی جیب سے بیٹی کو ادا کر دیتے ہیں۔ چونکہ نکاح ہو چکا ہوتا ہے اور شرعی طور پر دولہا کو دلہن سے ملاقات میں کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس لیے عموماً دلہن اپنی والدہ اور اپنے دولہا کے ہمراہ اپنے گھر کی چیزیں خریدتی ہے۔ جس میں گھر کا فرنیچر، کچن کا سامان، بیڈ سیٹ اور دوسری چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ باقی رقم کو وہ شادی کی تقریب پر خرچ کرتے ہیں۔ ایک ہی ہال بک کروایا جاتا ہے جس میں دولہا اور دلہن کے رشتے دار مرد و خواتین جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی کھانا ہوتا ہے اور تقریب ختم ہو جاتی ہے۔ دونوں طرف کے لوگوں کی شراکت کی وجہ سے آپس میں میل ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ پھر دلہن اپنے خاوند کے ساتھ اپنے گھر روانہ ہو جاتی ہے۔

بعض شادیاں اتنی سادگی کا نمونہ ہوتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے، مثلاً ہمارے اپنے جاننے والے مشائخ شادیوں میں خواتین کو نہیں بلواتے۔ بس دلہن کی والدہ، بہنیں اور دولہا کی والدہ اور بہنیں اپنے گھر میں جمع ہو جاتی ہیں اور دلہن کو تیار کر کے شادی ہال میں لے آتی ہیں اور وہیں سے رخصتی ہو جاتی ہے۔ میں کئی مرتبہ سوچتا ہوں کہ ہم نے بعض مسائل خود پیدا کر رکھے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو مختصر اور آسان بنا سکتے ہیں۔ آج سے کوئی 28 سال پہلے 1984ء کی بات ہے میں سعودی میڈیا سسٹم ریاض میں پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ اس ادارے میں سارے غیر ملکی تھے۔ امریکہ اور برطانیہ کے بھی بعض آرٹسٹ تھے۔ ان میں ''میری آن'' نامی ایک امریکی خاتون تھی۔ وہ بڑی سلجھی ہوئی پڑھی لکھی تھی۔ ایک دن مجھے کہنے لگی کہ جب میری شادی ہوئی تو میرے والد نے مجھے بلایا اور کہنے لگے: ''میری بات سنو! میں نے تمھاری شادی کے لیے کچھ رقم جمع کر رکھی ہے۔ اب تمھاری مرضی ہے کہ شادی کے موقع پر بلا گلا کر لو۔ ہم بینڈ باجے والوں کو بلا لیتے ہیں اور اگر تم چاہو تو اس مبلغ سے تم اپنے گھر کی چیزیں خرید لو۔''

قارئین! مجھے آج بھی ''میری آن'' کا جواب یاد ہے جو اس نے اپنے والد کو دیا تھا۔ ''ابا جان! بینڈ باجے والے محض ایک گھنٹے کے لیے آئیں گے۔

گلی میں شور شرابا مچا کر چلے جائیں گے اور آپ کی نہایت محنت سے جمع کی ہوئی پونجی بھی لے جائیں گے کہ یہ لوگ نہایت مہنگے ہوتے ہیں۔ میرے لیے بہتر یہ ہے کہ میں اس مبلغ سے اپنے گھر کی چیزیں خرید لیتی ہوں۔ یہ اشیاء سالہا سال میرے کام آئیں گی اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ آج شادی کے کتنے سال گزرنے کے باوجود وہ چیزیں میرے کام آرہی ہیں۔ میں اپنے والد کو یاد کرتی ہوں اور خوش ہوتی ہوں۔''

میں نے آپ کو ایک غیر مسلم خاتون کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کے خیالات کیا تھے۔ اگر ہم غور وفکر کریں تو یہ واقعی چند گھنٹے کا شو ہوتا ہے اور اکثر اوقات والدین کو مقروض کر کے گزر جاتا ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ خواہ آدمی کتنا بھی امیر کیوں نہ ہو یہ شادی بیاہ کے اخراجات اس کی جیب یقیناً خالی کر جاتے ہیں۔ ہم نے بہت ساری رسومات ہندوؤں سے ورثے میں لی ہیں۔ بارات کا تصور مکمل طور پر ہندوؤں سے لیا گیا ہے۔ ایک کتاب وواہ (Vi Vaxha) کے مطابق جس میں ہندوؤں کی مقدس کتابوں ''رگ وید اور اتھر وید'' کو بنیاد بناتے ہوئے شادی بیاہ کی رسومات بیان کی گئی ہیں۔ یہ مہندی، مایوں، بارات وغیرہ سب کی سب ہندوؤں کی مذہبی رسومات ہیں۔ ہم غور کریں کہ ہم شادی پر کتنے اخراجات کرتے ہیں۔ دو دن کی تقریبات میں شرکت کے لیے ہم کتنا اہتمام کرتے ہیں۔ سفر کے لیے خواہ بس ہو یا ویگن یا آپ کی اپنی کار ہو، سب کو معلوم ہے کہ سفر کا خرچ کتنا ہوتا ہے۔ کتنا پٹرول لگتا ہے۔ پھر سفر کی صعوبتیں اتنی زیادہ ہیں کہ انسان کتنا بھی آرام دہ سفر کیوں نہ کر رہا ہو اسے کوئی نہ کوئی پریشانی آ ہی جاتی ہے اور پھر کبھی ہم نے غور کیا کہ ان شادیوں پر ہم کتنا وقت ضائع کرتے ہیں اور پھر رسومات کی آڑ میں ہم کتنا پریشان ہوتے ہیں۔

قارئین کرام! میں کائنات کی سب سی اعلیٰ اور افضل خاتون سیدۃ نساء العالمین سیدہ فاطمۃ الزہراء کی شادی کا مختصر ذکر کر کے اپنی گزارشات کو ختم کروں گا۔ اللہ کے رسول ﷺ غزوۂ بدر سے واپس تشریف لا چکے ہیں۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کسی نے مشورہ دیا کہ آپ اللہ کے رسول سے سیدہ فاطمہ کا رشتہ کیوں نہیں طلب کرتے۔ آپ جائیں اور ان سے سیدہ کا رشتہ طلب کریں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس شادی کے لیے کچھ نہیں۔ مگر وہ شخصیت مسلسل امید دلاتی رہی اور پھر ایک روز سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ آگے کا واقعہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''جب میں اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے بیٹھا تو اللہ کی قسم! آپ کے رعب و دبدبہ، ہیبت اور احترام کے مارے کوئی بات نہ کر سکا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: «مَا جَاءَ بِكَ؟ أَلَكَ الْحَاجَةُ؟» ''کیسے آنا ہوا؟ کیا کوئی کام ہے؟'' میں خاموش رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَعَلَّكَ جِئْتَ تَخْطُبُ فَاطِمَةَ؟» ''شاید تم فاطمہ سے نکاح کے متعلق بات کرنے آئے ہو؟'' میں نے عرض کی: ایسا ہی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھارے پاس حق مہر میں دینے کے لیے کچھ ہے؟'' میں نے عرض کیا: نہیں، اللہ کی قسم اے اللہ کے رسول۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تمھیں جو زرہ دی تھی اس کا کیا بنا۔''

میں نے عرض کی: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں علی کی جان ہے وہ واقعی مضبوط اور بھاری زرہ تھی۔ لیکن اس کی قیمت چار درہم بھی نہیں ہے۔ وہ ابھی تک میرے پاس ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «قَدْ زَوَّجْتُكَهَا فَابْعَثْ إِلَيْهَا بِهَا فَاسْتَحِلَّهَا بِهَا» ''میں نے اس زرہ کو حق مہر مقرر کرتے ہوئے فاطمہ سے تمھارا عقد کر دیا۔ یہ زرہ فاطمہ کو دے دو اور گھر بساؤ۔'' (سنن الكبرىٰ للبيهقي، حديث: 14740: 234/7)

قارئین کرام! رحمت عالم ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا یہی حق مہر تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک دھاری دار چادر، مشکیزہ اور چمڑے کا ایک تکیہ، جس میں گھاس بھری ہوئی تھی، عنایت کیا تھا۔

قارئین کرام! کیوں نہ ہم اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اس موضوع پر بحث کریں۔ علمائے کرام خطبۂ جمعہ میں اس مسئلے کو بیان کریں۔ ہماری مجالس میں اس پر بات ہو اور پھر کوئی صاحب آگے بڑھ کر اس کی تنفیذ بھی کر دے۔ میں اپنے محترم قارئین سے اس مسئلے کے بارے درخواست کروں گا کہ اپنی رائے سے نوازیں۔ ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں ان آراء کو شائع کیا جائے گا۔ آپ بھی ضرور لکھیں، خواہ اس کی تائید میں ہو یا مخالفت میں ہو تاکہ لوگوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

محبکم

عبدالمالک مجاہد



باھمی قتل وغارت گری

مختصر تاریخ، سزا وعید اور بچاؤ کی تدابیر

حافظ محمد حق نواز ریسرچ فیلو دارالسلام

انسانی معاشرے کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے اس کی اولین دفعہ یہی ہے کہ انسان کی جان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کے معاشرتی حقوق میں سے پہلا حق ''زندہ رہنے کا حق'' ہے اور انسان کے معاشرتی فرائض میں سے پہلا فرض ''زندہ رہنے دینے کا فرض'' ہے۔ تمام مذاہب اور قوانین میں احترام نفس کا اخلاقی اصول ضرور موجود ہے کیونکہ اس کے بغیر پرامن زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔

دنیا کے سیاسی قوانین تو انسانی زندگی کی حفاظت کو صرف سزا کے خوف اور قوت کے ذریعے قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایک سچے مذہب کا کام یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں انسان کی صحیح قدر و قیمت پیدا کر دی جائے تاکہ جس جگہ قانونی تعزیر اور پولیس کا خوف نہ ہو وہاں بھی بنی آدم ایک دوسرے کے خون سے احتراز کریں۔ اسی نقطۂ نظر سے اسلام میں احترامِ نفس کی ایسی صحیح اور مؤثر تعلیم دی گئی ہے جو کسی دوسرے مذہب میں ملنی محال ہے۔ قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر اس تعلیم کو دل نشین بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا﴾ ''اس وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو قتل کردے، سوائے اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد کرنے والا ہو، تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو شخص کسی ایک جان کو (ناحق قتل ہونے سے) بچائے، تو گویا اس نے تمام لوگوں کی جان بچائی۔'' (المآئدۃ5: 32)

دوسرے مقام پر مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا﴾ ''اور وہ کسی نفس کو بھی جسے (مارنا) اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، ناحق قتل نہیں کرتے اور وہ زنا نہیں کرتے۔ اور جو کوئی یہ کام کرے گا، وہ گناہ کی سزا پائے گا۔''



(الفرقان25:68) ایک مقام پر فرمایا: ﴿ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ ''اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو، ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے، تاکہ تم عقل سے کام لو۔'' (الأنعام6:151)

اس تعلیم کے اولین مخاطب وہ لوگ تھے جن کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ وہ تو اپنے ذاتی فائدے کی خاطر اپنی اولاد کو بھی قتل کردیا کرتے تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ بھی گاہے گاہے مؤثر ترین انداز میں لوگوں کو احترام نفس کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «أَكْبَرُ الْكَبَائِرِ: الْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ، وَقَوْلُ الزُّوْرِ أَوْقَالَ: وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ» ''بڑے بڑے کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، کسی انسان کو ناحق قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹ بولنا یا جھوٹی گواہی دینا۔''

(صحيح البخاري:6871)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَا يَزَالُ الْمُؤْمِنُ فِي فُسْحَةٍ مِنْ دِيْنِهٖ مَالَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا» ''ایک مومن اس وقت تک برابر اپنے دین کی وسعت میں رہتا ہے جب تک وہ کسی کا ناجائز خون نہیں بہاتا۔''

(صحيح البخاري: 6862)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن لوگوں کے درمیان جس چیز کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کا دعویٰ ہو گا۔'' (صحيح البخاري: 6862)

حرمتِ نفس کی مذکورہ بالا تعلیمات چونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہیں اس لیے ان تعلیمات کا ایک ایک لفظ ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے۔ لہٰذا ان تعلیمات پر عمل پیرا ہونا، ان کی آگے تبلیغ و تلقین کرنا اور معاشرے میں ان کو نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنایا تو بہت ہی قلیل عرصہ میں عرب جیسی جنگجو اور خونخوار قوم میں احترامِ انسانیت کا مادہ پیدا ہو گیا۔ اسلامی تعلیمات نے جہاں انسان کی بہت سی غلط کاریوں اور گمراہیوں کا خاتمہ کیا وہیں دنیا میں پھیلی انسانی جان کی ناقدری کا بھی استیصال کر دیا۔ موجودہ دور میں دنیا کے قوانین میں حرمت نفس کو جو درجہ حاصل ہے یہ اس اسلامی انقلاب کے شاندار نتائج میں سے ایک روشن نتیجہ ہے جو اسلامی تعلیمات نے دنیا میں برپا کیا تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ» ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔''

(صحيح البخاري:7076)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَا تَرْجِعُوْنَ بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ» ''تم میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''

(صحيح البخاري:7077)

کسی مسلمان کو قتل کرنا کافر کا کام ہے۔

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو بڑے زور دار انداز میں ڈرا کر اس کی حرمت بیان فرمائی ہے۔ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے منیٰ کے میدان میں لوگوں سے خطاب کے دوران فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون سا دن ہے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ شاید آپ ﷺ یوم النحر کو کوئی دوسرا نام دینا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟'' صحابہ کرام نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کون سا شہر ہے؟ کیا یہ حرمت والا مہینہ نہیں ہے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس طرح اس شہر اور اس مہینہ میں اس دن کی حرمت ہے بعینہٖ تمھاری جان و مال، عزت و آبرو اور تمھاری کھال ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ سن لو! کیا میں نے (حکمِ ربانی) پہنچا دیا؟'' صحابہ کرام نے عرض کیا: جی ہاں، آپ نے پہنچا دیا ہے۔

(صحيح البخاري:7078)

اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب دو مسلمان آپس میں لڑ پڑیں اور ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر ڈالے تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے اور مقتول اس لیے جہنم میں جائے گا کہ وہ بھی قتل ہی کے ارادے سے لڑ رہا تھا۔''

(صحيح البخاري:7083)



ہمارے معاشرے میں ایک دوسرے سے گالی گلوچ کرنا، برا بھلا کہنا، غیبت، چغلی، دغابازی، سود خوری، رشوت ستانی اور جھوٹ جیسی برائیاں اس طرح جڑ پکڑ چکی ہیں کہ اب ان کا خاتمہ مشکل ہو چکا ہے۔ انھی برائیوں کی بنا پر معاشرے میں آئے دن جھگڑے، فساد اور لڑائیاں اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے قتل کے در پے ہو جاتے ہیں۔ جب دشمنی اور غصہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو پھر انسان کی عقل پر ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ اسے اپنا ہوش رہتا ہے نہ وہ اسلامی تعلیمات کا خیال رکھتا ہے، حالانکہ رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''جب تم میں سے کسی شخص کو اس حال میں غصہ آئے کہ وہ کھڑا ہوا ہے تو غصہ آنے پر اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے اگر بیٹھنے سے غصہ کافور ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ لیٹ جائے۔''

(مسند أحمد: 152/5)

انسان کو غصہ اسی وقت آتا ہے جب اس کی حق تلفی ہو یا اس پر ظلم و زیادتی کی جائے۔ معاشرے میں انصاف اور مساوات کے لیے انسان در در کی ٹھوکریں کھائے لیکن اسے کہیں بھی انصاف کی اُمید نظر نہ آئے تو پھر وہ ظالم کے خلاف میدان میں ضرور اترے گا۔ ظالم خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم اسے ظلم سے روکنا بہر حال ضروری ہے کیونکہ اسی میں اس کی بھلائی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہر حال میں اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' ایک صحابی نے پوچھا: یارسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کرنا سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر میں اس کی مدد کیسے کروں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اپنے بھائی کو ظلم سے روک لے یہ بھی اس کی مدد کرنا ہے۔''

(صحيح البخاري: 6952)

آپ ﷺ کا فرمان ہے: «اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ» ''مسلمان اس شخص کو کہتے ہیں جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''

(صحيح البخاري: 10)

اللہ تعالیٰ کی نظر میں سچا مسلمان بننے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم نہ کرے، اس کی چغلی اور غیبت نہ کرے، اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرے، ڈاکا نہ ڈالے، سودی کاروبار نہ کرے، ملاوٹ نہ کرے، رشوت نہ لے، جن چیزوں سے اللہ نے روکا ہے ان سے رک جائے اور جن چیزوں کا اس نے حکم دیا ہے ان کو بجا لائے۔ الغرض! ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق اپنی ساری زندگی گزارے۔ جب اس طریقے سے ہر مسلمان پہلے اپنی ذمے داریاں ادا کرے گا پھر اپنے حقوق کی طرف توجہ دے گا تو معاشرے میں امن وامان قائم ہو جائے گا۔ ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے۔ مساوات کی وجہ سے معاشرتی ناہمواری ختم ہو جائے گی اور قتل وغارت گری کا امکان باقی نہیں رہے گا۔

تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کریں تو ہمارے سامنے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا عہد امت مسلمہ کے لیے تابناک مثال ثابت ہوا ہے۔ اس دوران میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین سیاسی اختلافات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بعض منافقین کے ابلیسی ہتھکنڈوں سے حالات اس قدر پیچیدہ ہو گئے کہ آپ حسنِ نیت کے باوجود ان کے سلجھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن آپ کے طرز حکومت میں ملوکیت کا ذرا بھی شائبہ نہیں تھا۔ آپ نے اپنی زندگی اسی تقویٰ، طہارت اور سادگی و بے نفسی کے ساتھ بسر کی جو آپ کے پیشرو خلفائے ثلاثہ کا خصوصی شعار تھا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی صوابدید کے مطابق اسلام کے جمہوری نظام کو پوری طرح چلانے میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ آپ کے دور میں پرانی جاہلیت والی قبائلی اور خاندانی عصبیت پھوٹ پڑی تھی جس کی بنا پر تمام اخلاقی اور عملی قوتیں کمزور یا غیر معتدل ہو چکی تھیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد فتنوں اور آزمائشوں کا دور شروع ہو گیا۔

چھوٹے چھوٹے اختلافات اور غلط فہمیوں کی بنا پر مختلف ادوار میں مسلمانوں کے مابین باہمی تصادم بھی ہوا۔ جس سے امت مسلمہ کا سراسر نقصان ہوا اور مسلمان کمزور ہو گئے۔ یہ باہمی تصادم تاریخ اسلام کے خوبصورت چہرے پر ایک داغ ہے۔ اس خونریز باہمی تصادم کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے:

① **جنگ جمل:** سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا۔ ایک طرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے



سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینے کے لیے علم بلند کیا اور باقاعدہ وقت کے حاکم سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے قصاص دلوانے کا مطالبہ کیا اور لوگوں کو قصاص لینے کے لیے لڑائی پر ابھارا۔ دوسری طرف مکہ مکرمہ میں سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا نے طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کرام کے ساتھ مل کر عام مسلمانوں سے خطاب کے دوران میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون بے گناہ کے قصاص اور فتنہ وفساد کو دور کرنے کی دعوت دی اور عام مسلمانوں کو اس پر آمادہ کیا، چنانچہ ہزاروں مسلمان بصرہ کی طرف چل پڑے۔ پھر سبائیوں کی سازش کے نتیجے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکروں میں جنگ ہوئی جس میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سمیت دس ہزار قیمتی جانیں باہمی تصادم کی نذر ہوگئیں۔

② **جنگِ صفین:** یہ خونریز جنگ یکم صفر 37ھ کو شروع ہوئی۔ سبائی سازش کی وجہ سے ہزاروں افراد مارے گئے۔

③ **سانحۂ کربلا:** 61ھ میں سانحۂ کربلا پیش آیا، جس میں نواسۂ رسول سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سمیت کئی افراد نے جام شہادت نوش کیا۔

④ **خلافتِ عباسیہ کے قیام پر بنوامیہ کا قتل عام:** 132ھ میں عباسی سپہ سالار سلیمان بن علی نے بنواُمیہ کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کیا اور ان کی لاشیں سر عام کتوں کے سامنے پھینک دیں۔ علاوہ ازیں صرف خراسان میں ابومسلم خراسانی نے 6 لاکھ عربوں کو قتل کرایا۔

⑤ 656ھ میں ہلاکو خان نے بغداد میں لاکھوں افراد کو قتل کرایا اور بغداد کی لائبریریوں کی لاکھوں کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک دیں۔ اس طریقے سے اُس نے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے باعث بغداد کو تباہ و برباد کر ڈالا۔

⑥ سپین (اندلس) میں قیسی، کلبی اور بربر قبائل میں ہلاکت خیز جنگیں ہوئیں جو بالآخر اندلس میں مسلمانوں کی تباہی اور انخلا کا سبب بنیں۔

⑦ تیمور لنگ اور عثمانی ترک سلطان بایزید یلدرم میں خونریز جنگِ انگورہ۔

⑧ ایرانی صفویوں اور عثمانی ترکوں میں جنگوں کا طویل سلسلہ تقریباً دو سو سال جاری رہا۔ اس دوران میں لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔

⑨ سلطنت مغلیہ میں خونریز جنگ ہائے تخت نشینی میں ہزاروں افراد مارے گئے۔

ان جنگوں میں بے شمار مسلمانوں کا جان و مال ضائع ہوا۔

مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور انتشار سے نصاریٰ نے فائدہ اٹھایا اور فلسطین پر قابض ہو گئے۔ ان کے صلیبی لشکر فلسطین پر چڑھ دوڑے۔ 492ھ / 1099ء میں صلیبی بیت المقدس اور فلسطین پر قابض ہو گئے۔ تب اتابک عمادالدین زنگی اور اس کے فرزند سلطان نورالدین زنگی نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کیا۔ پھر مسلمانوں کے عظیم جرنیل صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کو متحد کیا اور 583ھ / 1187ء میں عیسائیوں کے 91 سالہ قبضے سے بیت المقدس کو آزاد کرا لیا۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے باعث گزشتہ صدی میں پہلی جنگ عظیم کے دوران میں برطانوی صلیبی بیت المقدس پر دوبارہ قابض ہو گئے اور انھوں نے 1948ء میں فلسطین میں اسرائیل کے نام سے یہودی ریاست قائم کر دی۔

امت مسلمہ آج پھر مختلف فرقوں اور جماعتوں میں بٹ چکی ہے۔ فروعی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کفار مسلمانوں پر ایسے ٹوٹ پڑے ہیں جیسے بھوکے لوگ کھانے پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ مسلمانوں کے ابدی و ازلی دشمن یہود و نصاریٰ اور ہنود ہمیشہ سے ایک خاص ایجنڈے کے تحت کام کر رہے ہیں۔ ان کا مشن یہی ہے کہ ملت اسلامیہ کو کبھی متفق و متحد نہ ہونے دیا جائے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ اگر دنیا کے تمام مسلمان آپس میں متفق ہو گئے تو پھر ساری دنیا میں مسلمانوں کو غالب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انھیں اس بات کا علم ہے کہ جب تین سو تیرہ تھے تو اس وقت انھیں کوئی روک نہ سکا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''بہترین رفیق چار ہیں اور اچھا سریہ (چھوٹا دستہ) چار سو آدمیوں کا ہے اور بہترین لشکر چار ہزار کا اور جب بارہ ہزار افراد پر مشتمل لشکر وجود میں آجائے گا تو وہ تعداد میں کمی کی بنا پر مغلوب نہیں ہو گا۔'' (سنن أبي داود: 2611) آج مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب سے زیادہ ہوگئی ہے۔ بس پختہ ایمان اور آپس میں اتحاد کی ضرورت ہے۔ طاغوتی طاقتیں مسلمانوں کو متحد نہیں ہونے دیتیں۔

آپس میں لڑتے ہیں، کفار کے غلبے کی صورت میں ان کی ساری خواہشات خاک میں مل جاتی ہیں۔ وہ پورے ملک کی معیشت تباہ کر دیتے ہیں، عزتوں کو پامال کرتے ہیں۔ پھر یہی مسلمان اپنے ہی ملک میں غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کفار کے اشارے پر اپنے ہی ہم وطن اور مسلمان بھائیوں کو چند ڈالروں کے عوض اغوا کرواتے ہیں۔ بعض کو خود قتل کر دیتے ہیں اور بعض کو کفار سے ڈرون حملے کروا کر قتل کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں جب بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا جائے گا تو انھی کے بہن، بھائی اور بیٹے جذبۂ انتقام میں خودکش اور بم دھماکے کر کے مزید بے گناہ مسلمانوں کا خون بہائیں گے۔ اس طریقے سے کفار کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور ان کا ذاتی نقصان بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ مختلف اسلامی ممالک میں کفار نے یہی خونی کھیل جاری رکھا ہوا ہے، مثلاً: عراق، افغانستان، فلسطین، شام، لبنان، سوڈان، کشمیر، بنگلہ دیش اور پاکستان وغیرہ میں کوئی دن خالی نہیں گزرتا کہ جس میں بے گناہ مسلمانوں کا

رہے ہیں کیونکہ ان کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کی افرادی قوت کمزور ہو۔ جب تک مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے رہیں گے، اختلافات کا شکار رہیں گے، ان کے تمام وسائل اختلافات کی نذر ہو جائیں گے، ان کی معیشت کمزور ہو جائے گی اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ مسلمانوں کے دونوں گروہ مختلف طریقوں سے یہودیوں کے زیر تسلط آ جائیں گے۔ بعض بطور قرض اسلحہ لے کر اور بعض سودی قرض لے کر۔ پھر ان کے شکنجے میں ایسے جکڑے جائیں گے کہ چھٹکارا ان کے لیے ممکن نہ ہو گا۔ ایسی صورت حال میں مسلم حکمران مع رعایا کفار کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اس صورت حال میں کفار اپنی ہی پالیسیاں بنا کر اس ملک کے حکمرانوں سے نافذ کروائیں گے۔ خواہ وہ تعلیمی، صنعتی اور زرعی پالیسیاں ہوں یا انھیں معاشی اصلاحات کا نام دے لیا جائے۔ بہرحال مستقبل میں نتائج کفار کے حق میں بہتر ثابت ہوں گے۔ آنے والی نسل نام کی تو مسلمان ہو گی لیکن ان کے کام کافروں والے ہوں گے۔

مہمان نوازی

اہمیت وفضیلت اور احکام وآداب



عبداللہ یوسف ذہبی

اللہ کے نبی ﷺ کی مہمان نوازی بڑی بے مثال تھی۔ جب آپ ﷺ پر غار حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ پریشانی کے عالم میں گھر تشریف لائے تو اس موقع پر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان الفاظ میں آپ ﷺ کو تسلی دی تھی:

''اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، بے کسوں کا بوجھ اپنے سر لیتے ہیں، مفلسوں کے لیے کماتے ہیں، مہمان کی عزت کرتے ہیں اور مشکل وقت میں حق کا ساتھ دیتے ہیں۔''

(صحيح البخاري: 5)

آپ ﷺ نہ صرف خود مہمان نواز تھے بلکہ اپنی امت کو بھی اس کی بڑی تلقین فرمائی ہے اور مہمان نوازی کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہیے۔'' (صحيح البخاري: 6138، و صحيح مسلم: 47)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی بھی بڑی بے مثال تھی۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ان کی مہمان نوازی کا خصوصی تذکرہ فرمایا ہے کہ جب دو فرشتے انسانی شکل میں ان کے پاس آئے تو انھوں نے کس انداز میں ان کی مہمان نوازی فرمائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''کیا تجھے ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے۔ وہ جب ان کے ہاں آئے تو سلام کیا، ابراہیم نے جوابِ سلام دیا اور (کہا: یہ تو) اجنبی لوگ ہیں۔ پھر چپ چاپ جلدی جلدی اپنے گھر والوں کی طرف گئے اور ایک فربہ بچھڑے کا گوشت لائے اور اسے ان کے پاس رکھا اور کہا: آپ کھاتے نہیں؟ پھر دل ہی دل میں ان سے خوفزدہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا: آپ ڈریئے نہیں۔ اور انھوں نے (سیدنا ابراہیم کو) ایک علم والے بیٹے کی بشارت دی۔'' (الذاريات 51:24-28)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعے سے مہمان نوازی کے بہت سے آداب مفسرین کرام نے اخذ کیے ہیں۔ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اپنی معروف کتاب ''سیرت النبی ﷺ'' میں چند آداب اس واقعے سے اخذ کر کے تحریر کیے ہیں



جو درج ذیل ہیں:

① مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونی چاہیے۔ ② مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے کیونکہ ''روغان'' کے معنیٰ سرعت کے ہیں۔ ③ روغان کے ایک معنی چپکے چپکے جانے یا وزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں۔ اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر مہمانوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے تو وہ از راہ تکلف اس کو روکیں گے۔ اس لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔ ④ کسی بہانے مہمانوں سے تھوڑی دیر کے لیے الگ ہو جانا چاہیے تا کہ ان کو آرام کرنے یا دوسری ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو۔ اسی لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے ان سے الگ ہو گئے تھے۔ ⑤ مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا تھا۔ ⑥ مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم (غم زدہ) ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے تا کہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل وعیال کے کام آئے۔ اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا (کیونکہ وہ فرشتے تھے) تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔ ⑦ نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے۔ اسی لیے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ ہم لوگ کھا پی نہیں سکتے بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کی بشارت دینے کے لیے آئے ہیں۔

(سیرت النبی:153/61)

یہ تو چند ضمنی اشارے تھے جو ابراہیم علیہ السلام کے واقعے سے ہمیں معلوم ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث مبارکہ میں بھی مہمان نوازی کے بعض آداب بیان فرمائے ہیں۔ اب ترتیب وار انھیں یہاں نقل کیا جائے گا۔

① دیگر اعمال صالحہ کی طرح مہمان نوازی میں بھی اپنی نیت کو خالص کرنا ضروری ہے۔ ضیافت کا مقصد فخر کرنا یا دوسروں سے بڑھنا نہ ہو بلکہ اسے انبیاء کی سنت سمجھ کر، مسلمان بھائیوں کو خوش کرنے اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر سرانجام دیا جائے۔

② کوشش کرنی چاہیے کہ نیک اور متقی لوگوں سے میل جول رکھا جائے اور اپنی ضیافت میں بھی ایسے ہی لوگوں کو دعوت دی جائے۔ فاسق و فاجر اور گنہگار لوگوں کو اس نقطہ نظر سے تو مدعو کیا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کے قریب ہوں اور انھیں دین سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے، ورنہ ایسے لوگوں سے بچنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا تُصَاحِبْ اِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ» ''صرف ایماندار کی صحبت اختیار کر اور تیرا کھانا صرف متقی ہی کھائے۔''

(سنن أبي داود:4832)

③ مہمانی کے لیے صرف امیر اور غنی لوگوں کو مخصوص نہ کیا جائے بلکہ فقراء کو بھی بلایا جائے۔ نبی مکرم ﷺ کا فرمان ہے: «شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيمَةِ يُدْعَى لَهَا الْأَغْنِيَاءُ وَيُتْرَكُ الْفُقَرَاءُ» ''بدترین کھانا اس ولیمے کا کھانا ہے جس میں دولت مندوں کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے۔'' (صحيح البخاري: 5177، و صحيح مسلم: 1432)

④ مہمان کی آمد پر اچھے انداز میں اس کا استقبال کیا جائے اور اسے محسوس کروایا جائے کہ اس کے آنے پر میزبان دل سے راضی اور خوش ہے۔ اس حوالے سے اسے مرحبا یا خوش آمدید جیسے الفاظ کہنا بھی اس کی دلجوئی کے لیے مناسب ہے۔

قبیلہ عبدقیس کا وفد جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: «مَرْحَبًا بِالْوَفْدِ الَّذِينَ جَاءُوا غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامَى» ''مرحبا ان لوگوں کو جو تشریف لائے ہیں۔ (اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے) وہ ذلت اور شرمندگی سے بچ گئے ہیں۔'' (صحيح البخاري: 6176، وصحيح مسلم: 17)

اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ کی پیاری بیٹی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس تشریف لائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مَرْحَبًا يَا ابْنَتِي» ''خوش آمدید میری بیٹی!'' (صحيح البخاري: 3623، وصحيح مسلم: 2450)

⑤ مہمان سے پوچھنے کی زحمت نہیں کرنی چاہیے کہ آپ ٹھنڈا لیں گے یا گرم۔ مہمان شرم کرتے ہوئے کہہ دیتا ہے کہ مجھے کسی چیز کی

طلب نہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ موسم اور مہمان کی طبیعت کے مطابق جو میسر ہو وہ پیش کر دیں۔ لیکن اگر مہمان کے بارے میں آپ کو یقین ہو کہ وہ اس بارے میں شرم نہیں کرے گا اور اپنی چاہت اور طلب کے متعلق بتا دے گا تو پھر پوچھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کے واقعے سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ وہ مہمانوں سے پوچھے بغیر چپکے سے ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنے چلے گئے تھے۔

⑥ اگر مہمان اچانک آ جائیں اور ان کے لیے کھانا پکانے کے لیے وقت نہ ہو تو ایثار کرتے ہوئے اپنے لیے تیار شدہ کھانا ہی مہمانوں کو پیش کر دینا چاہیے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''میں سخت حاجت مند ہوں۔'' آپ نے اپنے گھروں میں ایک آدمی بھیجا، لیکن تمام گھروں سے جواب ملا کہ ہمارے پاس پانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: ''کوئی ہے جو آج کی رات اسے اپنا مہمان بنا لے؟'' ایک انصاری صحابی اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میں انھیں مہمان رکھوں گا۔'' چنانچہ وہ انھیں لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا: ''دیکھو! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہے، اس کی خاطر تواضع کرنا۔'' بیوی نے کہا: ''گھر میں بچوں کے کھانے کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں ہے۔'' انصاری صحابی نے کہا: ''جو کچھ بھی ہے اسے لے آؤ اور چراغ جلا لو اور بچے اگر کھانا مانگیں تو انھیں سلا دو۔'' بیوی کھانا لے آئی اور چراغ جلا دیا اور بچوں کو بھوکا سلا دیا۔ پھر ان کی اہلیہ نے چراغ درست کرنے کے بہانے بجھا دیا۔ اس کے بعد وہ صحابی مہمان پر ظاہر کرنے لگے کہ گویا وہ بھی ان کے ساتھ کھا رہے ہیں، لیکن گھر کے سب افراد نے وہ رات فاقہ سے گزار دی۔ صبح کے وقت یہ صحابی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمھارے اور تمھاری بیوی کے رات کے عمل پر ہنس پڑا۔'' یا فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو تمھارا یہ معاملہ بڑا پسند آیا اور اس نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ''اور وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو۔'' (الحشر 9:59)

⑦ اگر میزبان نے نفلی روزہ رکھا ہو اور مہمان کے ساتھ اسے کھانا پڑ جائے تو وہ روزہ افطار کر سکتا ہے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے تو وہ روزے سے تھے۔ جب انھوں نے کھانا پیش کیا تو سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہیں کھائیں گے۔ چنانچہ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے (روزہ افطار کر کے) ان کے ساتھ کھانا کھایا۔
(صحيح البخاري: 6139)

مہمان کے لیے چند ہدایات

احادیث میں جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تکریم کی ہدایت کی گئی ہے وہاں مہمان کے لیے بعض چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جب مہمان اور میزبان میں سے ہر دو ان ہدایات اور تعلیمات کو ملحوظ رکھیں گے تو تب ہی ضیافت صحیح معنوں میں ضیافت ہو گی اور مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دونوں میں سے کوئی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر دوسرے پر سارا ذمہ ڈالتا ہے۔ مہمان کو درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

① مہمان کو چاہیے کہ جب کوئی اسے اپنے ہاں دعوت دے تو یہ اس کی دعوت کو قبول کرے۔ الا یہ کہ اس کے پاس کوئی معقول عذر ہو۔ مثال کے طور پر وہاں جانے سے دین کے نقصان کا خدشہ ہو۔ ایسی صورت میں اسے میزبان کے سامنے اپنے نہ آنے کی وجہ ضرور بیان کر دینی چاہیے تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «مَنْ دُعِيَ اِلٰى عُرْسٍ اَوْ نَحْوِهٖ فَلْيُجِبْ» ''جسے شادی وغیرہ کی دعوت کے لیے بلایا جائے، اسے قبول کرنی چاہیے۔'' (صحيح مسلم: 1429)

② ہر میزبان اپنے مہمان کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کی خاطر تواضع کرتا ہے، اس لیے اگر کوئی میزبان مالی لحاظ سے کمزور ہو تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق جو چیز بھی پیش کرے اسے بخوشی قبول کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''اگر مجھے بکری کے بازو (دستی) یا پائے کے لیے بلایا جائے تو میں ضرور دعوت قبول کروں گا اور اگر مجھے بازو یا پائے کا تحفہ دیا جائے تو میں اسے بھی قبول کروں گا۔''
(صحيح البخاري: 2568)



③ اگر کسی نے نفلی روزہ رکھا ہو اور کوئی اسے کھانے پر بلائے تو اسے انکار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے مسلمان بھائی کی دلجوئی کی خاطر روزہ افطار کر لینا چاہیے اور اس کی دعوت قبول کرنی چاہیے۔ اگر وہ روزہ افطار نہیں کرنا چاہتا تو اس کے لیے دعائے خیر کرے، نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لیے بلایا جائے تو وہ قبول کرے، اگر روزے سے ہے تو دعا کرے، اگر روزہ دار نہیں تو کھا لے۔'' (صحيح مسلم:1431)

رسول اللہ ﷺ سے بھی ایسے موقع پر روزہ افطار کر لینا ثابت ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے: ''کیا تمھارے پاس کچھ ہے؟'' ہم نے نفی میں جواب دیا تو آپ ﷺ فرمانے لگے: ''پھر میں روزے سے ہوں۔'' اور ایک دن نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہمیں حَیْس (گھی، پنیر اور کھجور کو ملا کر بنایا گیا کھانا) تحفے میں ملا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے دکھاؤ، میں نے تو صبح روزہ رکھا تھا۔'' (لیکن آپ ﷺ نے روزہ توڑ کر) اسے تناول فرما لیا۔ (صحيح مسلم: 1154)

④ مہمان کو چاہیے کہ تین دن سے زیادہ میزبان کے ہاں نہ ٹھہرے، کیونکہ تین دن سے زیادہ کسی کے ہاں مہمان بن کر کھانا، صدقہ کھانے کی طرح ہے۔ اور کوئی خوشحال آدمی صدقہ کھانا پسند نہیں کرتا۔

البتہ اگر میزبان زیادہ ٹھہرنے میں تکلیف محسوس نہ کرے بلکہ بخوشی اجازت دے دے یا مزید ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کرے تو پھر ٹھہرنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے ہمسائے کی عزت کرے اور جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور دستور کے مطابق مہمانی کرے۔'' پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! دستور کے مطابق مہمانی کیا ہے؟ فرمایا: ''ایک دن اور رات۔ ضیافت کی مسنون حد تین دن تک ہے۔ تین دن کے بعد وہ جو کچھ اس پر خرچ کرے گا، وہ اس پر صدقہ ہے۔'' (صحيح البخاري: 6019، وصحيح مسلم: 77/48) سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''مہمان کے لیے اپنے میزبان کے ہاں اتنا عرصہ ٹھہرے رہنا جائز نہیں کہ میزبان تنگی محسوس کرنے لگے۔'' (سنن ابن ماجه:3075)

⑤ مہمان کو چاہیے کہ صرف اتنے افراد کو اپنے ساتھ لے جائے، جتنے افراد کی دعوت دی گئی ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھ بن بلائے شخص کو لے جانا چاہتا ہے تو میزبان سے اجازت لے یا کم از کم اس کی رضامندی معلوم کر لے۔

ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار میں ابو شعیب نام کا ایک شخص تھا، اس کا لڑکا گوشت فروخت کرتا تھا۔ (ایک مرتبہ) اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر آپ کے چہرے سے بھوک کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے اپنے لڑکے سے کہا: ''جاؤ! پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرو، میرا ارادہ ہے کہ میں پانچ آدمیوں سمیت نبی ﷺ کی دعوت کروں۔'' اس نے کھانا تیار کر لیا۔ پھر وہ نبی ﷺ کے پاس گیا اور آپ کو پانچ آدمیوں کی دعوت دی۔ آپ کے ساتھ (پانچ کے علاوہ) ایک اور آدمی بھی چل پڑا۔ جب وہ شخص دروازے پر پہنچا تو نبی ﷺ نے (میزبان سے) پوچھا: ''یہ شخص ہمارے ساتھ آ گیا ہے، اگر تم چاہو تو اس کو اجازت دے دو اور اگر تم چاہو تو یہ شخص لوٹ جائے۔'' اس نے کہا: ''نہیں، اے اللہ کے رسول! میری طرف سے اجازت ہے۔'' (صحيح البخاري :2081، وصحيح مسلم: 2036)

⑥ مہمان کو چاہیے کہ واپس جانے سے پہلے میزبان کا شکریہ ادا کرے اور اس کے لیے دعائے خیر کرے۔ کھانا کھلانے والے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے یہ دعا ثابت ہے: «اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيمَا رَزَقْتَهُمْ فَاغْفِرْلَهُمْ وَارْحَمْهُمْ» ''اے اللہ! ان کی روزی میں برکت عطا فرما، ان کو بخش دے اور ان پر رحم فرما۔'' (صحيح مسلم: 2042)

نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاں کھانے کی دعوت پر تشریف لے گئے تو کھانے کے بعد آپ ﷺ نے انھیں ان الفاظ میں دعا دی: «اَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُونَ وَ اَكَلَ طَعَامَكُمُ الْاَبْرَارُ وَ صَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ» ''روزے دار تمھارے ہاں افطار کیا کریں، نیک لوگ تمھارا کھانا کھایا کریں اور فرشتے تمھیں دعائیں دیا کریں۔'' (سنن أبي داود :3854)



پاکستان اور اس کے اردگرد خطے کے حالات میں تیزی کے ساتھ تبدیلی آرہی ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے بھارت کی جانب سے پاکستانی چوکیوں پر جارحیت کا معاملہ ہے جس نے ایک بات واضح کردی ہے کہ بھارت افغانستان میں ہونے والے معاملات سے الگ رہنے کے لیے تیار نہیں ہے۔اسے اس بات کا خوف دامن گیر ہے کہ افغانستان سے امریکی انخلا کے بعد اگر اسے خطے میں کوئی بڑا کردار نہیں ملتا تو اس کی پوزیشن پاکستان کے سامنے انتہائی کمزور پڑ جائے گی۔اس کے ساتھ ساتھ کوئٹہ بلوچستان میں خونی بم دھماکے، کراچی میں لاشیں گرنے کا تسلسل، خیبر پختون خواہ میں غیر یقینی صورتحال اور اس کے بعد اسلام آباد کا دھرنا۔۔۔کیا یہ سب کچھ کسی ایک ہی منصوبے کا حصہ ہے؟ کیا یہ سب کچھ پاک فوج اور وطن کے دفاع کے ضامن دیگر اداروں کو الجھانے کی سازش ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے عوامل کیا ہیں۔ افغانستان کے اختتامی کھیل کے دوران ہی یہ سب کچھ کیوں کیا جارہا ہے؟

جہاں تک طاہر القادری کے دھرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں بعض ذرائع اس کے تانے بانے لندن اور واشنگٹن تک ملا رہے ہیں۔ کیونکہ آج سے دو برس قبل امریکہ نے نواز شریف پر یہ زور دینا شروع کیا تھا کہ وہ افغانستان سے متعلق اپنی پارٹی پالیسی واضح کریں لیکن ذرائع کے مطابق اس سلسلے میں نواز شریف نے امریکیوں کو ہاتھ نہیں پکڑایا۔ اس کے بعد یہی مشق عمران خان کے ساتھ دہرائی گئی لیکن وہ بھی امریکیوں کو اپنی افغان پالیسی واضح کرنے کے لیے تیار نہیں۔اس کے بعد عالمی اسٹیبلشمنٹ نے طاہر القادری کو متحرک کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یورپ میں اس سارے منصوبے کو حتمی شکل دی گئی تھی۔ اس کے بعد اسلام آباد میں موجودہ حکومتی اسٹیک ہولڈروں کو اس سے آگاہ کیا گیا جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ الیکشن میں التوا کروا کر نواز شریف کو اقتدار سے دور رکھا جائے اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اگر ملک میں ایمرجنسی کی صورتحال پیدا ہوجائے۔ ذرائع کے مطابق اس سے پہلے امریکہ اور برطانیہ کی جانب سے صدر زرداری کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے آئینی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسمبلیوں کی مدت کو ایک سال کے لیے بڑھا دیں تاکہ افغانستان سے امریکی انخلا کے موقع پر اسلام آباد میں کوئی ایسی مضبوط حکومت نہ قائم ہوسکے جو افغانستان میں امریکی مفادات کے راستے میں روڑے اٹکا سکے لیکن یہ کام حکومت تنہا نہیں کرسکتی تھی، اس کے لیے اپوزیشن کو اعتماد میں لینا ضروری تھا جس پر صدر زرداری نے نواز شریف کو اعتماد میں لینے کی ایک کوشش بھی کی تھی لیکن نواز شریف الیکشن کے التوا پر بالکل راضی نہ ہوئے جس کے بعد ''لانگ مارچ'' کا سارا پلان ترتیب دیا گیا تھا۔لیکن اس سارے معاملے پر اوس اس وجہ سے پڑ گئی کہ فوج کسی بھی قسم کی مہم جوئی کے لیے تیار نہ تھی کیونکہ اس کی ساری توجہ اس وقت



افغانستان کے معاملات کو سنبھالنے کی جانب مرکوز ہے۔ دوسری جانب متحدہ اپوزیشن نے حکومت اور خارجی قوتوں کو اپنے اجلاس میں پیغام دے دیا کہ الیکشن کے التوا کی ہر کوشش کو ہر قیمت پر ناکام بنا دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ طاہر القادری کے بار بار الٹی میٹم کے بعد آخر حکومت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ ڈرامے کا ڈراپ سین کر کے طاہر القادری کو باعزت اس دھرنے سے نکلنے کا راستہ مہیا کیا جائے اور یوں ایک روز قبل یزید اور ظالم حکمران کہلوانے والے حکمرانوں نے ''مذاکرات'' کے نام پر طاہر القادری کو دھرنے کے گڑھے سے باہر نکالا۔ اب محترم ''شیخ الاسلام'' ان مذاکرات کو اپنی کامیابی قرار دے کر عازم کینیڈا ہونے کی تیاریوں میں ہیں۔

دوسری جانب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ کی افغانستان میں صورتحال پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔ اب امریکیوں کو یہ بات سمجھ آہی گئی کہ افغانستان کا مسئلہ پائیدار مذاکرات کے بغیر اور اس میں سب سے بڑے فریق افغان طالبان کو شامل کیے بغیر حل ہو ہی نہیں سکتا، بصورت دیگر طالبان کسی صورت امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو افغانستان سے سلامتی کے ساتھ نکلنے نہیں دیں گے۔ منصوبے کے مطابق افغانستان سے امریکہ کے انخلا کے بعد خطے میں بھارت کو امریکہ کی جانشینی کے فرائض انجام دینے تھے لیکن موجودہ صورتحال میں بھارت اور اسرائیل کے تمام منصوبوں پر پانی پھرتا نظر آرہا ہے۔ اس خفت کی وجہ سے بھارت مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی سرحدی چوکیوں پر غصہ اتار رہا ہے۔ اس لیے اس بات پر بھی سوچا جارہا ہے کہ بھارت کی جانب سے پاکستانی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کا نیا سلسلہ کیا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے؟ اس سارے معاملے کو مدنظر رکھ کر اگر افغانستان میں طالبان کی حکمت عملی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ افغان طالبان کسی طور بھی اپنی عسکری کارروائیاں مذاکرات کی آڑ میں کم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس بات سے امریکی بھی بڑی حد تک آگاہ ہو چکے ہیں۔

دوسری جانب اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ افغان طالبان، امریکہ اور کرزئی حکومت کے درمیان خاصا فاصلہ ہے اور اس فاصلے کو یکدم طے نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ کرزئی کی پہلے سے یہ خواہش تھی کہ افغانستان میں جو بھی پیش رفت ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکہ کا قیام افغانستان میں مزید طویل رکھا جائے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکیوں کے مکمل منصوبے سے کرزئی بھی آگاہ نہیں ہے ۔ فی الحال یہی بات سامنے آرہی ہے کہ امریکہ 2014ء میں افغانستان سے نکل جائے گا کیونکہ افغان طالبان امریکہ کو یہ وارننگ دے چکے ہیں کہ ''اگر امریکہ انخلا کے بعد بھی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کچھ فوجی دستے افغانستان میں غیر معینہ مدت تک قیام کریں تو اس کا مطلب ہوگا کہ خطے میں جنگ اور تباہی کا سلسلہ جاری رہے گا اور کرزئی حکومت اگر ایک بھی امریکی فوجی کی افغانستان میں موجودگی چاہے گی تو وہ مزید تباہی کی ذمہ دار ہوگی۔'' یہی وہ صورتحال ہے جس کے تحت امریکہ اسلام آباد میں کوئی مضبوط حکومت نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس سلسلے میں امریکیوں کو سب سے زیادہ خطرہ مسلم لیگ ن سے ہے۔ ان کے خیال میں نواز شریف چونکہ سعودی عرب کے زیادہ قریب ہیں اس لیے افغانستان کے معاملے میں وہ اس پالیسی کو ترجیح دیں گے جو پاکستان کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے مفاد میں بھی ہو جو بھارت اور امریکہ کو کسی طور منظور نہیں۔

قارئین کو اس بات کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا کہ خطے میں جاری صورتحال کا صرف اسی خطے کے تناظر میں جائزہ نہیں لیا جاسکتا، حالات تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی موجودہ صورتحال کوئی اچانک واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کے عوامل خاصے وسیع ہیں۔ بھارت کو خطے میں امریکہ اور اسرائیل کے سب سے بڑے اتحادی کا اسٹیٹس حاصل ہے۔ اس لیے اگر بھارت کی جانب سے کوئی بڑا قدم اٹھایا جاتا ہے تو اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ اس میں امریکہ اور اسرائیل اور ان کے صہیونی صلیبی اتحادی پوری طرح ملوث ہیں۔ امریکہ نہ صرف اس خطے میں انتہائی احتیاط سے قدم بڑھا رہا ہے بلکہ یہی صورتحال اس نے مشرق وسطی میں اختیار کر رکھی ہے۔ 2013ء بہت سے معاملات میں انتہائی اہم اور فیصلہ کن سال ہے۔ امریکہ اور اسرائیل کے خیال میں جب تک پاکستان کے پاس جوہری ہتھیار موجود ہیں وہ مشرق وسطی میں کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا



سکیں گے۔ اس مقصد کی خاطر وہ بھارت کو خطے میں اہم کردار دے چکے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں اس نے ایک بڑے ملک کی حیثیت سے نہ صرف پاکستان کے اسلامی تشخص کو امن اور مذاکرات کے ذریعے ختم کرنا ہے بلکہ بنگلہ دیش اور دیگر مسلم اکثریتی علاقوں میں اپنی بالا دستی قائم رکھنی ہے۔ اگر خاکم بدہن پاکستان اپنے جوہری ہتھیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو اس سے نہ صرف جنوبی ایشیا کے مسلمان ہندو سامراج کے سامنے نہتے ہو جائیں گے بلکہ مشرق وسطی میں اسرائیل مکمل طور پر من مانی پر اتر آئے گا۔ دوسری جانب غیر جوہری پاکستان کی وجہ سے چین کا مغربی بازو عدم تحفظ کا شکار ہو جائے گا اور گوادر تک رسائی کا چینی خواب سنکیانگ میں ہی ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے پاکستان کے جوہری اثاثے نہ صرف خود پاکستان بلکہ چین، جنوبی ایشیا کے مسلمانوں اور مشرق وسطی کے عرب ممالک کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ پاکستان کے جوہری اثاثوں کی سب سے بڑی محافظ چونکہ پاک فوج ہے اس لیے اب پاک فوج کو مختلف محاذوں پر الجھانے کی سازش عروج پر ہے۔ کراچی میں اپنے مقامی ایجنٹوں اور مافیا کے ذریعے جو قتل وغارت کا بازار گرم کیا گیا تھا اس کا بڑا مقصد پاک فوج کو کراچی میں الجھانا تھا۔ اس سے پہلے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں جو خونریزی کروائی گئی اس کا بڑا مقصد بھی پاک فوج کو قبائلیوں سے دست وگریباں کروانا تھا لیکن عسکری قیادت نے کمال دانش مندی سے شمالی وزیرستان میں آپریشن کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہی صورتحال بلوچستان میں پیدا کی گئی۔ کون نہیں جانتا قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں پیدا کی گئی صورتحال میں بھارت اور دیگر ملکوں کا کتنا ہاتھ ہے مگر امریکہ اور برطانیہ کی جانب سے مسلط کردہ این آر او زدہ نام نہاد جمہوری حکومت نے اس سلسلے میں کوئی سیاسی پیش رفت نہ کی۔ کیونکہ مذاکرات چونکہ سیاسی حکومت کے ذریعے ہی ممکن ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے جو سیاسی سیٹ اپ اس وقت اسلام آباد پر مسلط ہے اسے خود اپنی بقا پاک فوج کے الجھے رہنے میں نظر آ رہی ہے۔

پاکستانی قوم کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ بھارت کی جانب سے کی جانے والی دہشت گردی کو کوئی حادثاتی واقعہ نہ سمجھے۔ یہ سب کارروائیاں ایک خاص پیرائے میں کی جا رہی ہیں اور اس دہشت گردی کی واردات نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ پاکستان کے وہ لبرل حلقے جو دونوں ملکوں کے درمیان امن کے خواب دیکھ رہے ہیں کس قدر زمینی حالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان امن مذاکرات، تجارت اور افغانستان کے لیے راہ داری کے معاملے سب کچھ ایک خاص ایجنڈے کا حصہ ہے۔ بھارت اس بات سے سخت خوفزدہ ہے کہ اگر امریکہ کے جانے کے بعد افغانستان میں طالبان یا طالبان نواز کوئی اور حکومتی سیٹ اپ آ گیا تو مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے خلاف جاری تحریک آزادی زور پکڑ لے گی اور جو کچھ بھارت امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی موجودگی میں افغانستان میں کرتا رہا ہے اس کا جواب کہیں افغان مقبوضہ کشمیر میں نہ دینے آ جائیں۔ ایسی صورت میں بھارت کی پالیسی کیا ہوگی اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے بھارت افغانستان کے کسی بھی پائیدار حل سے پہلے پاکستان کے خلاف کوئی مہم جوئی کر سکتا ہے۔ اس لیے پاکستان کے عسکری اداروں کو چاہیے کہ وہ افغانستان اور پاکستان کی داخلی صورتحال کے ساتھ ساتھ بھارت کی معمولی نقل وحرکت پر بھی پوری طرح نظر رکھیں کیونکہ 2013ء کا سال نہ صرف اس خطے کے لیے بلکہ دنیا کے دیگر خطوں کے لیے انتہائی فیصلہ کن سال ہے۔ پاکستان کی داخلی سیاست میں آگے کیا ممکن ہے تو موجودہ صورتحال کے تناظر میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ زرداری گروپ نے اب تک پنجاب میں مسلم لیگ ن کے خلاف جو بھی سیاسی اقدامات کیے ہیں وہ بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ سلمان تاثیر کے خلا کو پر کرنے کے لیے پی پی کی مقامی قیادت کو متحرک کیا گیا لیکن کوئی کام نہ بن سکا۔ اس کے بعد چوہدری برادران کا پتہ کھیلا گیا لیکن صورت حال میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے بعد وٹو کو پنجاب روانہ کیا گیا لیکن وہ اس مرتبہ چلے ہوئے کارتوس ثابت ہوئے۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ الیکشن میں طاہر القادری کی جماعت کو پی پی کی پنجاب میں بڑی پشتی بانی سونپی جانے والی ہے کیونکہ ''شیخ الاسلام'' کے حالیہ دھرنے کے بعد ہونے والے مذاکرات میں درحقیقت آئندہ کے سیاسی سیٹ اپ میں طاہر القادری کے لیے جگہ بنانے پر غور کیا گیا ہے.....۔



آپ کے مسائل اور ان کا حل

ابوالحسن حافظ عبدالخالق، ریسرچ فیلو دارالسلام

سوال تین سال پہلے ہماری دکان کو کسی نے آگ لگا دی تھی اور تقریباً 25 لاکھ کا نقصان ہوا۔ ہمیں جن پر شک تھا ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا، اور مقدمہ تاحال جاری ہے۔ مدعا علیہم کہتے ہیں کہ ہم سے جس قسم کی آپ صفائی لینا چاہیں ہم تیار ہیں۔ اس بارے میں ہماری شرعی راہ نمائی فرمائیں؟

جواب شرعی اصول یہ ہے کہ مدّعی کو اپنے دعویٰ پر کوئی پختہ دلیل پیش کرنا لازمی ہوتا ہے۔ حدیث میں اسے «اَلْبَيِّنَة» سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لفظِ «اَلْبَيِّنَة» عام ہے، خواہ دو گواہ ہوں، یا کم از کم ایک گواہ اور ایک قسم یا بعض وہ قرائن وشواہد کہ جن کی روشنی میں انسان کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ پائے اور مسئلے کی تسلی بخش وضاحت ہو جائے۔ یہ سب «اَلْبَيِّنَة» ہی کی صورتیں ہیں۔

اگر مدعی اپنے دعویٰ پر کوئی پختہ ثبوت پیش نہ کر سکے تو مدعا علیہ شرعاً حلف دینے کا مکلّف ہوتا ہے اگر مدعی کے مقابلے میں وہ قسم اٹھا لیتا ہے تو شرعاً اسے بریٔ الذمہ سمجھا جائے گا، اور کسی نقصان یا چٹی کا اسے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا۔

چونکہ مذکورہ فیصلے میں آپ کے پاس فریق مخالف کو مجرم قرار دینے کا کوئی پختہ ثبوت، دلیل یا گواہان موجود نہیں، معاملہ صرف شک کی بنیاد پر مبنی ہے۔ اس لیے مدعا علیہم سے حلف لیا جائے گا، اس طریقے سے آپ ان سے تصفیہ کر سکتے ہیں، ذہن میں رہے حلف بھی متعلقہ شخص مدعا علیہ ہی اٹھائے گا، مدّعی کے مدّعی علیہ پر عدم اعتماد کی بنا پر کسی اور شخص کو اس کا ذمہ دار نہیں بنایا جائے گا۔

مذکورہ شرعی اصول کے دلائل نبیِ کریم ﷺ کی صحیح احادیث مبارکہ ہیں اور کچھ وہ مقدمات ہیں جن کا فیصلہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اس دستور کے مطابق فرمایا۔

مثلاً: اشعث بن قیس الکندی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک کنویں کی ملکیت کی بابت ان کا جھگڑا اپنے چچا زاد سے ہوا۔ کنواں جس جگہ تھا اس کا مالک ان کا چچا زاد تھا۔ جب معاملہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش ہوا تو آپ ﷺ نے اشعث رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «بَيِّنَتُكَ أَوْ يَمِينُه» ''تمھارا ثبوت، یعنی کوئی دلیل یا اس کی قسم ہو گی۔'' اشعث بن قیس کہتے ہیں، میں نے کہا: اللہ کے رسول! وہ تو فاسق فاجر انسان ہے، قسم اٹھائے گا اور اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہو گی۔ تب رسول اکرم ﷺ نے جھوٹی قسم کھانے اور اس کے ذریعے کسی کا مال ہتھیانے پر زبردست وعید سنائی۔

(صحيح البخاري: 4550، 2670)

ایک روایت کے الفاظ ہیں: «شَاهِدَاكَ أَوْ يَمِينُهُ» ''تیری طرف سے دو گواہ یا پھر اس کی طرف سے قسم ہو گی۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح مسلم میں یہ حدیث بھی آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ، لَادَّعَى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَ



أَمْوَالَهُمْ، وَلٰكِنَّ الْيَمِيْنَ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ» ''اگر لوگوں کو ان کے صرف دعووں کی بنیاد پر دے دیا جائے تو بہت سے لوگ دوسرے افراد کے خون اور ان کے اموال کا لازماً دعویٰ کرنے لگ جائیں گے، لیکن اصول یہ ہے کہ مدعا علیہ پر قسم ہے۔''
(صحيح مسلم:1711)

ترمذی شریف کی معروف حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے دورانِ خطبہ ارشاد فرمایا: «اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي، وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ» ''ثبوت (دلیل، گواہ وغیرہ کا پیش کرنا) مدعی پر ہے اور قسم مدعا علیہ پر۔'' (جامع الترمذي:1341)

جبکہ سنن الدارقطنی میں «وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ أَنْكَرَ» کے الفاظ منقول ہیں۔ (سنن الدارقطني، حديث:3091، مؤسسة الرّسالة)

سوال خلع سے کیا مراد ہے؟ نیز خلع کے بعد دوبارہ اس بیوی سے رجوع یا نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب لفظ خُلْع خَلَعَ الثَّوبَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کپڑے یا لباس اتارنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ''وہ تمھارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔'' (البقرة 2: 187) چونکہ اس طریقے سے یہ دونوں ایک دوسرے سے جدائی اختیار کر لیتے ہیں، اس لیے اس طریقۂ جدائی کو خلع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگرچہ اس کی تعریف کی بابت علماء کی مختلف عبارات ہیں لیکن مقصود اور ماحصل قریباً ایک ہی ہے۔ «وُقُوْعُ الْفُرْقَةِ بَيْنَ الزَّوْجَيْنِ بِتَرَاضِيْهِمَا، وَبِعِوَضٍ تَدْفَعُهُ الزَّوْجَةُ لِزَوْجِهَا» ''میاں بیوی کے درمیان آپس کی رضا مندی سے جدائی کا واقع ہونا، ایسے عوض کے بدلے جو عورت خاوند کو ادا کرتی ہے۔''
(صحيح فقه السنة از أبو مالك كمال بن السيد سالم:340/3)

مغنی میں ہے: ''خلع یہ ہے کہ عورت مہر میں وصول کی ہوئی رقم خاوند کو واپس کر کے اس سے جدائی اختیار کرے۔''
(المغني:67/7، وفتح الباري:496/1)

نیز ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر عورت اپنے خاوند کو اس کی خلقت وصورت یا اس کی سیرت و کردار اور اخلاق یا دین یا عمر میں بڑا ہونے یا کمزور ہونے یا اس کی مثل کسی اور وجہ سے ناپسند کرتی ہو اور ڈرتی ہو کہ وہ اس کی فرمانبرداری میں اللہ کا حق ادا نہیں کر سکے گی تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس سے اپنے نفس کے بدلے میں معاوضہ (مہر وغیرہ) بطور فدیہ ادا کر کے جدائی اختیار کر لے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾ ''اگر تمھیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے تو عورت رہائی پانے کے لیے کچھ دے ڈالے، اس میں دونوں پر گناہ نہیں۔'' (المغني لابن قدامه: 1748/2، مطبوعه بيت الأفكار الدولية)

حدیث میں ہے، ایک دن رسول اللہ ﷺ صبح سویرے نکلے تو حبیبہ بنت سہل رضی اللہ عنہا کو اندھیرے میں اپنے دروازے پر پایا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ کون ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: میں حبیبہ بنت سہل ہوں۔ آپ علیہ السلام نے پوچھا: ''تمھارا کیا حال ہے؟'' کہنے لگیں: یا میں نہیں یا ثابت نہیں۔ جب ثابت بن قیس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''یہ حبیبہ بنت سہل ہے جو کچھ اللہ کو منظور تھا اس نے مجھ سے کہہ دیا ہے۔'' وہ کہنے لگی: یا رسول اللہ! جو کچھ ثابت نے مجھے دیا، وہ میرے پاس موجود ہے۔ آپ ﷺ نے ثابت سے کہا: «خُذْ مِنْهَا» ''جو کچھ تم نے اسے دیا ہے وہ اس سے واپس لے لو۔'' ثابت نے اس سے لے لیا اور وہ اپنے گھر والوں میں بیٹھ گئی۔
(سنن أبي داود: 2227)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں ثابت بن قیس کے اخلاق اور دین میں کوئی عیب نہیں لگاتی لیکن اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَتَرُدِّيْنَ عَلَيْهِ حَدِيْقَتَهُ؟» ''کیا تو اسے اس کا باغ واپس کر دے گی؟'' وہ بولی: جی ہاں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِقْبَلِ الْحَدِيْقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً» ''اپنا باغ لے لو اور اسے طلاق دے دو۔'' (صحيح البخاري: 5273)

رہا دوسرا مسئلہ کہ خلع کے بعد اگر طرفین سے آپس میں ملنے کی آمادگی ہو تو آیا رجوع ہو گا یا تجدید نکاح؟

چونکہ راجح موقف اور دلائل کی روشنی میں خلع فسخ ہے طلاق نہیں، اس لیے خلع کے بعد رجوع تو نہیں ہوسکتا، البتہ تجدید نکاح ہوگا، مہر کی ادائیگی بھی ہو گی اور باقی شرائط نکاح بھی



ملحوظ رکھی جائیں گی۔

سوال مروجہ حلالہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کی قباحت و شناعت پر روشنی بھی ڈالیں؟ (سائل: قاری شیخ سلمان زکریا، آف شارجہ)

جواب پہلے خاوند کے لیے عورت کو حلال کرنے کی غرض سے طلاق کی نیت سے کسی دوسرے مرد سے محدود مدت کے لیے نکاح کرنا مروجہ حلالہ ہے، شرعاً نکاح نہیں، بلکہ نکاح کے بجائے متعہ سے قریب تر ہے کیونکہ نکاح ایک شرعی حکم ہے جس کا مقصد خانہ آبادی ہے، صرف وقتی مفاد نہیں، ورنہ پیسے دے کر زنا کرنے اور اس میں کوئی بڑا فرق نہیں۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے ایک شخص نے پوچھا: ''کوئی شخص اگر اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دے اور دوسرا کوئی شخص اس کے ساتھ مشورہ کیے بغیر اس کی مطلقہ سے اس نیت سے نکاح کرے کہ وہ اپنے پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے تو کیا وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے گی؟ انھوں نے فرمایا: ''نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مرد نے اسے گھر میں بسانے کے لیے نکاح کیا ہو، اور پھر کسی وجہ سے طلاق دی تو تب پہلے خاوند کے لیے حلال ہوگی۔ حلالے کے لیے نکاح کو ہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں زنا شمار کرتے تھے۔'' (مستدرك حاكم: 199/2، الإرواء للألباني: 311/6)

چونکہ حلالے کی غرض سے نکاح کرنے والے کا مقصد اس عورت کو گھر میں باقاعدہ آباد کرنا قطعاً نہیں ہوتا اس لیے ایسا نکاح کرنے والا اور جس کی خاطر یہ نکاح کر رہا ہے دونوں ملعون ہیں، نیز اس طریقے سے نکاح کرنے والے کو کرائے کا سانڈ کہا گیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور جس کی خاطر کیا جائے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (سنن الترمذي:1120، مسند أحمد: 462,448/1) اس مفہوم کی احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ان کے نام بھی ذکر کیے ہیں جن میں سیدنا علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ، عقبہ بن عامر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ (إعلام الموقعين عن ربّ العالمين: 41/3) سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمھیں کرائے کے سانڈ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیوں نہیں اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ حلالہ کرنے والا ہے۔ اللہ کی لعنت ہو حلالہ کرنے والے اور اس پر جس کے لیے حلالہ کیا جاتا ہے۔''

(سنن أبي داود: 1936)

حلالے کا نکاح کرنے والا جب مباشرت کرے گا تو حمل ٹھہرنے اور بچہ پیدا ہونے کا امکان بھی ہے تو اس صورت میں حمل ضائع کروانے کا گناہ الگ سے ہوگا۔ یاد رہے شریعت نے زنا کی صورت میں ہونے والا حمل بھی ضائع کرنے سے روکا ہے۔

المختصر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی حلالے کے حلال ہونے کا قائل نہیں تھا بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ اگر حلالہ کرنے والا میرے پاس آئے تو میں اس کو رجم کر دوں گا۔ (اعلام الموقعين: 46/3) اس لیے ایسا نکاح شرعاً حرام اور ناجائز ہے اور اس سے عورت پہلے شوہر کے لیے حلال بھی نہیں ہوگی۔ یہ درحقیقت زنا ہے جس میں نکاح کو بطور آڑ استعمال کیا گیا ہے۔ کوئی بھی ایمان والا غیرت مند یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اپنی بیوی چند دن کے لیے کسی مرد کو استعمال کرنے کے لیے دے اور پھر اسے اپنے حرم میں لے آئے۔

درست شعر لیکن غلط موقع پر

کچھ راہزن لوٹ مار کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ جب ان کی گردنیں مارنے کا وقت آیا تو ان میں سے ایک نے کھڑے ہو کر کہا: ''میرے بارے میں اللہ سے ڈرو! میں ان کے ساتھ لوٹ مار نہیں کر رہا تھا بلکہ صرف شراب نوشی کر رہا تھا اور ان کے لیے گانے گا رہا تھا۔''

سپاہیوں نے کہا: ٹھیک ہے، تھوڑا ہمیں بھی سناؤ۔ اس شخص نے گانے کی کوشش کی لیکن اسے سوائے ایک شعر کے کوئی اور شعر یاد نہیں آیا۔ شعر یہ تھا:

عن المرء لا تسأل وسل عن قرينه
فكل قرين بالمقارن يقتدي

''آدمی کے بارے میں پوچھنے کی بجائے اس کے ساتھی کے بارے میں پوچھو کیونکہ ہر کوئی اپنے ساتھی کی پیروی کرتا ہے۔''

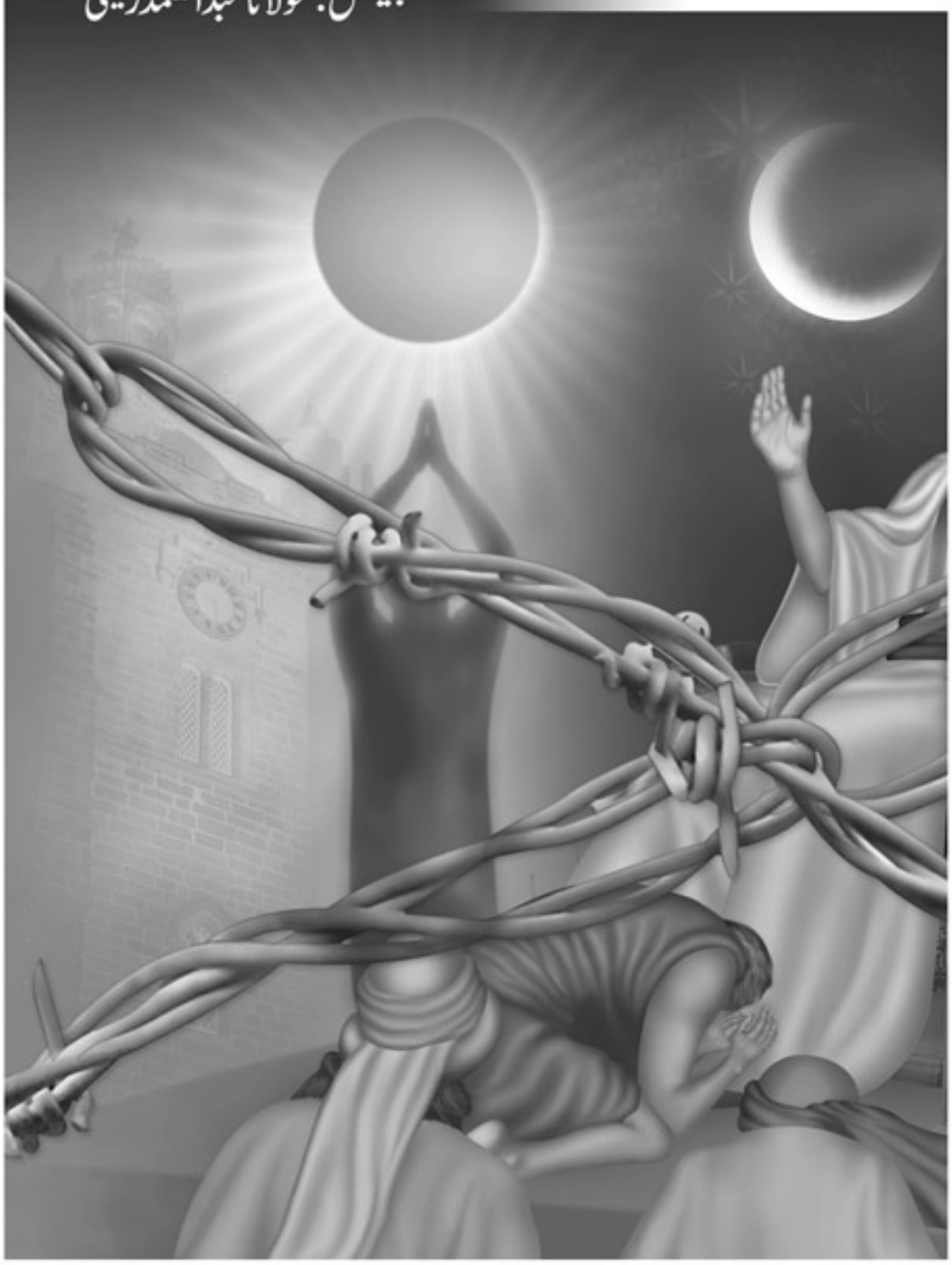
سپاہیوں نے کہا: ''یہ شخص صحیح کہتا ہے۔ اس کی گردن مارو۔''

(بهجة المجالس وأنس المجالس، ص773).

مشرکینِ عرب کا شرک

ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

مولانا صفی الرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ
پیشکش: مولانا عبدالصمد رفیقی



مشرکین عرب بھی ہم مسلمانوں کی طرح صرف اللہ تعالیٰ ہی کو آسمان و زمین اور ساری کائنات کا خالق اور مالک مانتے تھے۔ ان کا بھی ایمان تھا کہ وہی روزی اور اولاد دیتا ہے، بارش برساتا ہے اور پودے اُگاتا ہے۔ سب کچھ اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جس کو پکڑنا چاہے دنیا کی کوئی طاقت اسے بچا نہیں سکتی اور جسے بچانا چاہے دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ چاند، سورج، ستارے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہ اگر دنیا والوں پر رات ہی رات کر دے تو کسی کی مجال نہیں کہ دن لا سکے، اور اگر دن ہی دن کر دے تو کسی کی مجال نہیں کہ رات لائے۔ وہی رات ختم کر کے دن لاتا ہے اور دن ختم کر کے رات لاتا ہے۔ پہاڑ، چشمے، دریا، باغات سب اسی کے بنائے اور اگائے ہوئے ہیں۔ وہی اس کائنات کا سارا نظام چلا رہا ہے، وہی مجبوروں کی آہیں اور فریادیں سنتا ہے اور دعائیں قبول کرتا ہے۔ غرض ان سارے معاملات میں اللہ تعالیٰ کے متعلق مشرکین مکہ کا عقیدہ وہی تھا جو مسلمانوں کا ہے۔

یہاں پہنچ کر فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مشرکین عرب کے وہ کون سے عقائد اور عمل تھے جن کی وجہ سے ان کو مشرک قرار دیا گیا، اور ان کی مخالفت مول لے کر عرصے تک ان کے نہایت سنگین اور بھیانک مظالم سہے گئے، ملک و وطن چھوڑا گیا، جنگیں لڑی گئیں، اور فریقین کے بہت سے افراد خاک وخون کی نذر ہوئے اور اس وقت تک جنگ کا سلسلہ بند



نہ ہوا جب تک مشرکین اپنے ان عقائد واعمال سے تائب نہیں ہو گئے؟

اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو سب کچھ مانتے ہوئے بھی کچھ دوسری ہستیوں کو بھی اپنی حاجت روائی ومشکل کشائی کے لیے پکارتے تھے، ان سے مرادیں مانگتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔

لیکن اس جواب کی تہ سے پھر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جنھیں حل کیے بغیر ان کے شرک کا صحیح نقشہ سامنے نہیں آ سکے گا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ وہ دوسری ہستیاں کون سی تھیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ ان ہستیوں کو کیا سمجھ کر حاجت روائی ومشکل کشائی کے لیے پکارتے تھے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ وہ ان ہستیوں کی عبادت اور پوجا پاٹ کس طرح کرتے تھے؟ چوتھا سوال یہ ہے کہ مشرکین کس مقصد کے تحت ان کی عبادت کرتے تھے۔ اگلی سطور میں ترتیب وار ان سوالوں کے جوابات ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا سوال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ وہ دوسری ہستیاں کون سی تھیں جنھیں مشرکین پکارتے اور پوجتے تھے؟ اس سلسلے میں قرآن کے ارشادات یہ ہیں: ﴿وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ ”ان مشرکین نے کہا کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان (فرشتوں) کی عبادت نہ کرتے، انھیں اس کا علم نہیں، وہ محض اٹکل دوڑاتے ہیں۔“ (الزخرف 20:43)

اور ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ﴾ ”اور جس دن وہ (اللہ) ان سب کو اکٹھا کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ یہی لوگ تو ہیں جو تمھاری پوجا کرتے تھے۔ فرشتے کہیں گے: خدایا! تو پاک ہے، تو ہی ہمارا ولی ہے۔ یہ لوگ نہیں ہیں۔ یہ درحقیقت جن و شیطان کی پوجا کرتے تھے، اکثر انھیں پر ایمان رکھتے تھے۔“

(سبا 34:40،41)

ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ مشرکین فرشتوں کی پوجا کرتے تھے۔ سورہ فرقان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَا اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ﴾ ”اور جس دن اللہ ان (مشرکین) کو اکٹھا کرے گا اور جن کو اللہ کے سوا یہ پوجتے ہیں (انھیں بھی اکٹھا کرے گا) پھر پوچھے گا کہ کیا تم لوگوں نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود ہی راستے سے بھٹک گئے تھے؟ وہ کہیں گے اے اللہ تو پاک ہے، ہمارے لیے درست نہ تھا کہ ہم تیرے سوا کسی اور کو ولی بناتے۔“

(الفرقان 25: 17-18)

اور بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا﴾ ”یعنی (مشرکین) جن لوگوں کو پکارتے ہیں وہ لوگ خود اللہ تعالیٰ کے قرب کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس فکر اور کوشش میں رہتے تھے کہ کون اللہ تعالیٰ کا زیادہ مقرب ہے اور اسی کی رحمت کی امید رکھتے تھے اور اس کے عذاب سے ڈرتے تھے۔ تیرے رب کا عذاب واقعی ڈرنے کی چیز ہے۔“ (بنی اسرائیل 57:17)

قرآن کی ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ مشرکین جن ہستیوں کی عبادت کرتے تھے اور جن کو مدد کے لیے پکارتے تھے وہ محض لکڑی پتھر کی مورتیاں نہ تھیں بلکہ وہ مکمل باشعور مخلوق، یعنی ایسی نیک ہستیاں اور ایسے بزرگ لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم تھے۔ اسی کو اپنا مولیٰ مانتے اور جانتے تھے، اس کی عبادت میں لگے رہتے تھے تاکہ اس کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کر لیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی لگی رہتی تھی اور عذاب کا خوف بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت لکڑی یا پتھر کی بے جان مورتیوں کی نہیں بلکہ بزرگان دین، اولیائے کرام اور اللہ کے سچے پکے اور نیک بندوں کی ہے۔ لہٰذا ان آیات سے معلوم ہوا کہ مشرکین اولیاء اور بزرگوں کو بھی پوجا کرتے تھے، اس کی مزید تفصیل ہمیں حدیث، تفسیر اور سیرت کی کتابوں سے ملتی ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بات مروی ہے کہ نبی ﷺ نے جب مکہ فتح کیا تو خانہ کعبہ کے گرد رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بتوں کو توڑ ڈالا اور کعبہ کے اندر رکھے ہوئے بتوں کو نکلوایا تو اس میں سیدنا ابراہیم اور سیدنا



اسماعیل علیہ السلام کی مورت بھی نکالی گئی۔ ان کے ہاتھ میں فال کے ذریعے قسمت معلوم کرنے کے تیر تھے۔ آپ نے ان دونوں پیغمبروں کی مورت تڑوا دی اور فرمایا کہ ان پیغمبروں نے پانسے کے تیر کبھی استعمال نہیں کیے۔
(صحيح البخاري: 4288)

سورہ نوح میں قوم کے چند معبودوں ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کا تذکرہ نام لے کر کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ سب بزرگانِ دین کے نام ہیں۔ ان کے وفات پا جانے کے بعد لوگوں نے ان کی قبروں کی مجاوری شروع کر دی اور پھر ان کے بت بنا لیے گئے۔ (صحيح البخاري: 4920)

کتب سیرت میں مذکور ہے کہ جب عرب میں بت پرستی کا دور دورہ شروع ہوا تو عمرو بن لحی نے ان ہستیوں کے بت لا کر مختلف قبیلوں میں پھیلا دیے۔

قرآن مجید کی سورہ نجم میں لات، عزی اور مناۃ کا ذکر ہے۔ یہ مشرکین عرب کے تین مشہور بتوں کے نام ہیں۔ لات کے بارے میں صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے «كَانَ اللَّاتُ رَجُلًا يَلُتُّ سَوِيقَ الْحَاجِّ» ''لات ایک آدمی تھا جو حاجیوں کا ستو گھولا کرتا تھا۔'' (صحيح البخاري: 4859) یہ شخص درحقیقت مکہ اور طائف کے درمیان حاجیوں کے راستے میں ایک سفید چٹان پر بیٹھا رہتا تھا اور گزرنے والے حاجیوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ جب یہ انتقال کر گیا تو وہیں دفن کر دیا گیا۔ چٹان اس کی قبر پر رکھ دی گئی اور آستانہ بنا دیا گیا۔ لوگ نذریں وغیرہ چڑھانے لگے۔ یہاں کوئی مورتی نہیں بنائی گئی تھی۔

خلاصہ یہ کہ مشرکینِ عرب، فرشتوں کو، پیغمبروں کو، اولیائے کرام کو، بزرگان دین کو، صالحین اور نیکو کار انسانوں کو، جنھیں وہ خدا کا مقرب اور مقبول بارگاہ سمجھتے تھے، اپنی حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے پکارتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ کبھی بت بنا کر اور کبھی قبروں اور آستانوں کی شکل میں۔ لیکن اصل اہمیت بتوں اور آستانوں کی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس ہستی کی ہوتی تھی جس کا بت یا آستانہ بنایا جاتا تھا۔ البتہ جب کسی ہستی کا بت یا آستانہ بن جاتا تھا تو وہ بلکہ اس کے قریب کے درخت وغیرہ بھی مقدس اور متبرک سمجھے جانے لگتے تھے۔ چنانچہ عزیٰ کے آستانے پر ببول کے تین درخت تھے، لوگ ان کی بھی تعظیم کرتے تھے، اور اس کی ڈالی وغیرہ نہیں توڑتے تھے کہ اگر توڑیں گے تو تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ فتح مکہ کے موقع پر نبی ﷺ نے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ وہ آستانہ ڈھا کر درخت کاٹے بغیر چلے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ دوبارہ جا کر سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک کالی بھجنگ پراگندہ بال والی عورت کو دیکھا۔ اسے قتل کر دیا اور درختوں کو کاٹ ڈالا اور واپس آ کر روداد سنائی تو نبی ﷺ نے فرمایا: ہاں یہی عزیٰ ہے۔

مشرکین کے ایک اور مقدس درخت کا بھی تذکرہ ملتا ہے جسے ذات انواط کہتے ہیں۔ یہ بیر کا درخت تھا۔ (جامع الترمذي: 2180)

اب دوسرے سوال کو لیجیے کہ مشرکین عرب ان ہستیوں یعنی فرشتوں، پیغمبروں اور اولیائے کرام وغیرہ کو کیا سمجھ کر حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے پکارتے اور ان کی پوجا کرتے تھے؟ قرآن کے مختلف بیانات سے اس کا جو جواب نکلتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ مشرکین سمجھتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت ہی مقرب ہستیاں ہیں۔ اگر وہ کسی کے بارے میں سفارش کر دیں تو اللہ تعالیٰ اسے رد نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے خود ان ہستیوں کو بھی بعض بعض معاملات میں تصرف کرنے کا اختیار دے رکھا ہے، مثلاً: اولاد اور روزی دینا، بیمار کو تندرست کرنا، مصیبتیں اور بلائیں ٹالنا اور بگڑی بنانا۔ لڑائی میں اپنے ماننے والوں کو فتح اور دشمن کو شکست دینا وغیرہ۔ چنانچہ مشرکین کو جنگِ احد میں کامیابی ہوئی تو ابوسفیان نے ہبل کی جے پکارنے کے بعد نعرہ لگایا: «لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ» ''ہمارے لیے عزیٰ ہے، تمھارے لیے عزی نہیں۔'' (صحيح البخاري: 4043) مشرکین سمجھتے تھے کہ عزی دیوی جنگ میں ہم کو فتح اور مخالفین کو شکست دیتی ہے۔ اسی لیے یہ نعرہ لگایا گیا تھا۔

اب مزید سنیے! سورہ زمر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾ ''کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں؟ اور یہ مشرکین اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔'' (الزمر 36:39) مشرکین نبی ﷺ کو دھمکیاں دیتے



تھے کہ تم ہمارے معبودوں کو ناکارہ کہنے سے باز آ جاؤ ورنہ کسی دن یہ تمھیں تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔ چونکہ مشرکین کا خیال تھا کہ ہم جن ہستیوں کو پوجتے ہیں انھیں بگڑی بنانے اور نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کی جگہ جگہ تردید کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا﴾ ”یہ اللہ کے سوا ایسوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور کافر درحقیقت اپنے رب کا مخالف ہے۔“

(الفرقان 55:25)

ایک جگہ فرمایا گیا: ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ﴾ ”آپ (ﷺ) کہہ دیں کہ تم لوگ اللہ کے علاوہ جن کو سمجھتے ہو پکار دیکھو۔ وہ آسمان و زمین میں ذرے برابر بھی کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے اور آسمان و زمین میں ان کی کوئی شرکت نہیں اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے۔“ (سبا 22:34)

ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا﴾ ”آپ (ﷺ) کہہ دیجیے کہ اللہ کے علاوہ جن ہستیوں کو تم نے سمجھ رکھا ہے انھیں پکار دیکھو۔ وہ تم سے تکلیف دور کرنے اور پھیر دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔“

(بنی اسرائیل 56:17)

اس مضمون کی آیتیں قرآن میں بہت ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ مشرکین ان ہستیوں، یعنی فرشتوں، پیغمبروں، اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے تھے اور اپنے اسی خیال کی بنا پر انھیں پکارتے، ان سے التجائیں کرتے اور ان کی دہائیاں دیتے تھے۔ قرآن نے بتایا کہ ان کو سرے سے اس طرح کا کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی کی پکار اور فریاد سن سکتے ہیں اور نہ کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔

اس جگہ ایک اور نقطہ واضح کر دینا ضروری ہے۔ مشرکین ان ہستیوں میں نفع ونقصان پہنچانے اور تصرف کرنے کا جو اختیار مانتے تھے وہ کچھ لامحدود اور خدائی اختیار کے برابر نہیں مانتے تھے بلکہ کچھ خاص دائروں اور خاص علاقوں میں محدود سمجھتے تھے۔ اسی لیے سمندر میں جب ان کا جہاز ڈوبنے لگتا ہے تو وہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر صرف اللہ کو پکارتے۔ ارشاد ہے: ﴿وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا﴾ ”اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم جاتے ہیں پھر جب وہ (اللہ) تمھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو، اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔“

(الاسراء 67:17)

اس مضمون کی بعض اور آیتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین سمندر کے اندر ان ہستیوں کی کارفرمائی نہیں سمجھتے تھے۔

اسی طرح مشرکین ان ہستیوں میں جو کچھ اختیار مانتے تھے وہ ذاتی اور مستقل نہیں مانتے تھے بلکہ اصل مالک تو وہ اللہ ہی کو مانتے اور سمجھتے تھے، البتہ ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی اختیار میں سے کچھ ان ہستیوں کو بھی دے دیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا بیان ہے: ﴿قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ﴾ ”اے پیغمبر! آپ کہہ دیجیے کہ کس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ (بتاؤ) اگر تم لوگ جانتے ہو۔ وہ کہیں گے کہ (یہ سارا اختیار) اللہ کے لیے ہے۔“ (المومنون 88:23، 89)

اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کے قبضے اور اختیار میں مانتے تھے، پس دوسروں کو ان کے عقیدے کے مطابق جو کچھ اختیار ملا وہ لازماً اللہ کے دینے سے ملا۔ اس کی مزید وضاحت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہوتی ہے کہ مشرکین حج کے موقع پر لبیک پکارتے ہوئے لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ کے بعد یہ بھی کہتے تھے کہ «اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ» ”(اے اللہ) تیرا کوئی شریک نہیں مگر ایسا شریک جو تیرے ہی قبضے میں ہے۔ تو اس شریک کا بھی مالک ہے، اور اس شریک کے اختیار میں جو کچھ ہے اس کا بھی مالک ہے۔“ (صحیح مسلم: 1175)

مشرکین کے اس لبیک سے دو باتیں معلوم



ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے جن شرکاء کو پوجتے تھے انھیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی طاقت اور اختیار میں شریک مانتے تھے جو طاقت و اختیار دوسری مخلوق کو حاصل نہیں ہے، مثلاً: وہ چاہیں تو آگ سرد ہو جائے اور ''اُٹھ'' کہہ دیں تو مردہ زندہ ہو جائے اور اٹھ کر بیٹھ جائے وغیرہ۔ اسے ہم خدائی تصرف یا کُن فَیَکُون والی طاقت کہہ سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مشرکین اپنے شرکاء میں اس طرح کی جو طاقت اور اختیار مانتے تھے وہ ذاتی نہیں مانتے تھے بلکہ ان کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ طاقت دی ہے۔ اور یہ طاقت پانے کے بعد بھی وہ ہمہ وقت اللہ کے قبضے اور اختیار میں ہیں۔ یعنی ان کی طاقت اور ان کا اختیار عطائی ہے اور اللہ کی ماتحتی میں ہے۔

اب تیسرا سوال لیجیے کہ مشرکین ان ہستیوں کی، یعنی فرشتوں، پیغمبروں، بزرگوں اور اولیائے کرام کی عبادت اور پوجا پاٹ کس طرح کرتے تھے؟ اس کا جواب قرآن مجید میں بڑی وضاحت اور تفصیل سے ملتا ہے۔ جو یہ ہے:

① مشرکین نے ان ہستیوں کے جو بت یا آستانے بنا رکھے تھے وہاں کچھ خاص لوگ مجاور بن کر بیٹھے رہتے تھے اور یہ طریقہ قدیم زمانے سے رائج تھا۔ چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ ﴿مَا تَعْبُدُونَ﴾ ''تم لوگ کیا پوجتے ہو؟'' اس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا: ﴿نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ﴾ ''ہم بت پوجتے ہیں، اور ہم (ہمیشہ) انھی کے مجاور رہیں گے۔''
(الشعرآء 71:26)

② ایک خاص دن ایسا مقرر رہتا تھا جس میں عام لوگ ان آستانوں کی زیارت کے لیے میلے اور عرس کی شکل میں جمع ہوتے تھے۔ جسے حج یعنی زیارت کہتے تھے۔ یہ طریقہ بھی دورِ قدیم سے رائج تھا۔ قرآن کا بیان ہے کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات ملی اور وہ دریا پار کر کے آگے بڑھے تو ﴿فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ﴾ ''وہ لوگ ایک قوم کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں پر جماؤ کیے ہوئے تھے۔'' (الاعراف 138:7) یعنی اس کی زیارت کے لیے یہ میلہ یا عرس لگائے ہوئے تھے۔

زیارت کے اس خاص دن کے علاوہ بھی مختلف لوگ اپنی مختلف اغراض اور ضروریات کے تحت تقریباً روزانہ ہی ان آستانوں پر حاضر ہوتے تھے اور عاجزی و نیاز مندی کے ساتھ مختلف قسم کی حرکتیں کرتے تھے۔

③ وہ لوگ مذکورہ بالا ہستیوں کے نام پر بنے ہوئے بتوں اور آستانوں کو سجدہ کرتے تھے۔ اللہ نے اس سے سختی کے ساتھ منع کیا اور صرف اپنے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا: ﴿فَاسْجُدُوا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوا﴾ ''اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔'' ﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ ''سورج اور چاند کو سجدہ مت کرو، اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے اگر واقعی تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔''
(حم السجدۃ 37:41)

④ سجدے کے علاوہ وہ لوگ بتوں اور آستانوں کا طواف بھی کرتے تھے۔ لات، مناۃ اور ذی الخلصہ کے گرد طواف کا تذکرہ حدیث و تفسیر اور سیرت کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ مناۃ کی زیارت کرنے والے تو بیت اللہ کا طواف کر کے صفا و مروہ کے درمیان دوڑ ہی نہیں لگاتے تھے بلکہ مکہ سے لبیک لبیک پکارتے ہوئے قدید میں مناۃ کے آستانے پر پہنچ کر مناۃ کا طواف کرتے تھے۔ اِدھر جو لوگ صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے وہ بھی اس طواف کا مقصد یساف اور نائلہ نامی دو بتوں کو ٹھہرا لیتے تھے۔ اس لیے اسلام کی آمد کے بعد صحابہ کرام کو صفا و مروہ کے طواف میں تأمل ہوا۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ ''صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں کا (یعنی صفا اور مروہ کا) طواف کرے (کیونکہ اسلام میں یہ طواف یساف و نائلہ کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے ہو رہا تھا۔)
(البقرۃ 158:2)

⑤ طواف کے علاوہ آستانے والی ہستیوں کے نام پر نذر اور قربانی کا بھی بڑا وسیع سلسلہ جاری تھا۔ قربانی کے ان کے یہاں دو طریقے تھے: ایک طریقہ یہ تھا کہ جانور آستانے پر لے جا کر



ذبح کرتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جانور کو آستانے پر نہ لے جاتے بلکہ اپنے گھر پر یا میلے میں یا کسی بھی جگہ ذبح کر دیتے۔ البتہ ذبح کرتے وقت اللہ کے بجائے اس ہستی کا نام لے لیتے تھے۔ قرآن مجید میں ان دونوں قسم کے ذبیحوں کو حرام قرار دیا گیا۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں حرام جانوروں کی اقسام بتاتے ہوئے کہا گیا: ﴿وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ ''وہ جانور بھی حرام ہے جس پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔'' (المائدۃ 3:5) اور فرمایا کہ ﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ ''وہ جانور بھی حرام ہے جسے آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔'' (المائدۃ 3:5) سورہ انعام میں فرمایا گیا: ﴿وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ﴾ ''اور تم اس (جانور) کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ پڑھا گیا ہو۔'' (الأنعام 121:6)

وہ فسق ہے (یعنی حرام ہے)۔ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے بوانہ میں اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی تھی۔ انھوں نے نبی ﷺ سے مسئلہ پوچھا تو آپ ﷺ نے دریافت کیا: ''کیا وہاں جاہلیت کا کوئی بت پوجا جاتا تھا؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہاں ان کا کوئی میلہ اور تہوار لگتا تھا؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی نذر پوری کر لو۔ اور یاد رکھو کہ اللہ کی معصیت میں کوئی نذر پوری نہیں کرنی ہے اور نہ ہی ایسی نذر پوری کرنی ہے جس کا انسان مالک نہ ہو۔'' (سنن أبي داود:3313)

⑥ ذبح کے علاوہ ان ہستیوں کے لیے نذر ماننے اور چڑھانے کا جو سلسلہ تھا اس کی نشاندہی بھی قرآن میں کی گئی ہے، ارشاد ہے: ﴿وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا﴾ ''اللہ نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے ہیں، ان میں سے ایک حصہ مشرکین نے اللہ کے لیے مقرر کیا اور ایک حصہ اپنے شرکاء کے لیے، پھر کہا کہ یہ اللہ کے لیے ہے، ان کے خیال میں، اور یہ ہمارے شرکاء کے لیے ہے۔'' (الأنعام 136:6)

خلاصہ یہ ہے کہ وہ غلے اور چوپائے کی پیداوار سے اللہ کے نام پر بھی نذر نکالا کرتے تھے اور ان ہستیوں کے نام پر بھی جنھیں اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، پھر نذر کے لیے نکالے ہوئے غلے اور جانور کو کھانے کے سلسلے میں اور اس جانور کو استعمال کرنے کے سلسلے میں کچھ خاص پابندیاں تھیں جن کی طرف اللہ نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے: ﴿وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ﴾ ''اور اپنے (جھوٹے) خیال کے مطابق انھوں نے کہا: یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع ہیں، انھیں بس وہی کھا سکتا ہے جسے ہم چاہیں، اور بعض چوپائے ہیں جن کی پشت (پر سواری) حرام کر دی گئی، اور بعض چوپائے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں پڑھتے، یہ سب وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہوئے کرتے ہیں۔'' (الانعام6: 138) خلاصہ یہ کہ نذر کے چوپائے اور غلے عام غلوں اور چوپایوں کی طرح استعمال نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ان کا خاص مصرف اور الگ ضابطہ تھا۔

مشرکین کے یہاں جانوروں کی نذر ماننے کے کچھ اسباب و مواقع بھی مقرر تھے، اور اسی مناسبت سے ان کا ایک خاص نام مقرر ہوتا تھا۔ امام المغازی محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ کوئی اونٹنی جب دس مرتبہ مسلسل مادہ بچہ ہی کو جنتی تو اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا، نہ اس پر سواری کی جاتی، نہ اس کا بال کاٹا جاتا، نہ مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ پیتا۔ اس اونٹنی کو سائبہ کہا جاتا تھا۔ اگر یہ اونٹنی اس کے بعد بھی مادہ بچہ دیتی تو اس بچے کا کان چیر کر اسے بھی ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نہ سواری کی جاتی، نہ بال کاٹا جاتا، نہ مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ پیتا، اسے بحیرہ کہتے تھے۔ اگر کوئی بکری پانچ پیدائش میں دس مادہ بچہ جنتی۔ درمیان میں کوئی بھی نر نہ ہوتا تو اس بکری کو وصیلہ کہتے تھے اور آئندہ اس بکری سے جو کچھ پیدا ہوتا اسے مرد کھاتے، عورتیں نہ کھاتیں۔ البتہ اگر مردار ہوتا تو دونوں کھاتے۔ اگر کسی نر اونٹ کی جفتی سے دس بار مسلسل مادہ بچہ پیدا ہوتا تو وہ اونٹ آزاد کر دیا جاتا، نہ اس کی سواری کی جاتی نہ بال کاٹا جاتا، نہ کوئی کام لیا جاتا۔ اسے حامی کہتے تھے۔ (سیرت ابن هشام :1/89-90)

اللہ تعالیٰ نے ان سب پر نکیر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا



سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ ''اللہ نے نہیں بنایا کسی کو بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام اور لیکن یہ کافر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔''
(المائدۃ 5:103)

دوسرے سوال کے سلسلے میں اب تک کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا کہ مشرکین اللہ کے علاوہ دوسری ہستیوں یعنی فرشتوں، پیغمبروں، اولیائے کرام، بزرگانِ دین اور نیکوکار انسانوں کی پوجا کرتے تھے، اس کا طریقہ یہ تھا کہ ان ہستیوں کے آستانوں پر کچھ حضرات مجاور بن کر بیٹھ رہتے تھے۔ اور عام لوگ میلے اور عرس کی شکل میں کسی خاص دن ان کی زیارت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عام ایام میں بھی حاضری و زیارت کا سلسلہ چالو رہتا تھا۔ زیارت کرنے والے بڑی عاجزی اور نیاز مندی سے پیش آتے تھے، آستانوں کو کبھی سجدہ کرتے تھے کبھی ان کے گرد چکر لگاتے تھے۔ کھجور، غلے اور کھانے کی چیزیں، دودھ وغیرہ ان پر نذر کے طور چڑھاتے تھے۔ جانور قربان کرتے تھے اور جانور کو ان کی نذر مان کر آزاد چھوڑ دیتے تھے ..... یہی سب اللہ کے علاوہ دوسری ہستیوں کی عبادت اور پوجا پاٹ تھی، جسے مشرکین نے اختیار کر رکھا تھا۔

اب چوتھا اور آخری سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مشرکین کس مقصد کے تحت ان کی عبادت کرتے تھے۔ قرآن میں اس کا بیان بھی بہت صاف لفظوں میں موجود ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نہ نقصان دیتی ہیں اور نہ نفع دیتی ہیں، اور وہ کہتے ہیں: یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔'' (یونس 10:18)

مشرکین آخرت کے قائل نہ تھے، اس لیے ان کا یہ مطلب نہ تھا کہ قیامت کے روز ہماری سفارش کر کے بخشوائیں گے۔ بلکہ یہ مطلب تھا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کہہ سن کر ہماری مرادیں پوری کرا دیتے ہیں۔ مصیبتیں ٹلوا دیتے ہیں، یعنی حاجت روائی و مشکل کشائی کرا دیتے ہیں۔ سورہ زمر میں ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ ''اور جن لوگوں نے اس کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں، (وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔''
(الزمر 39:3)

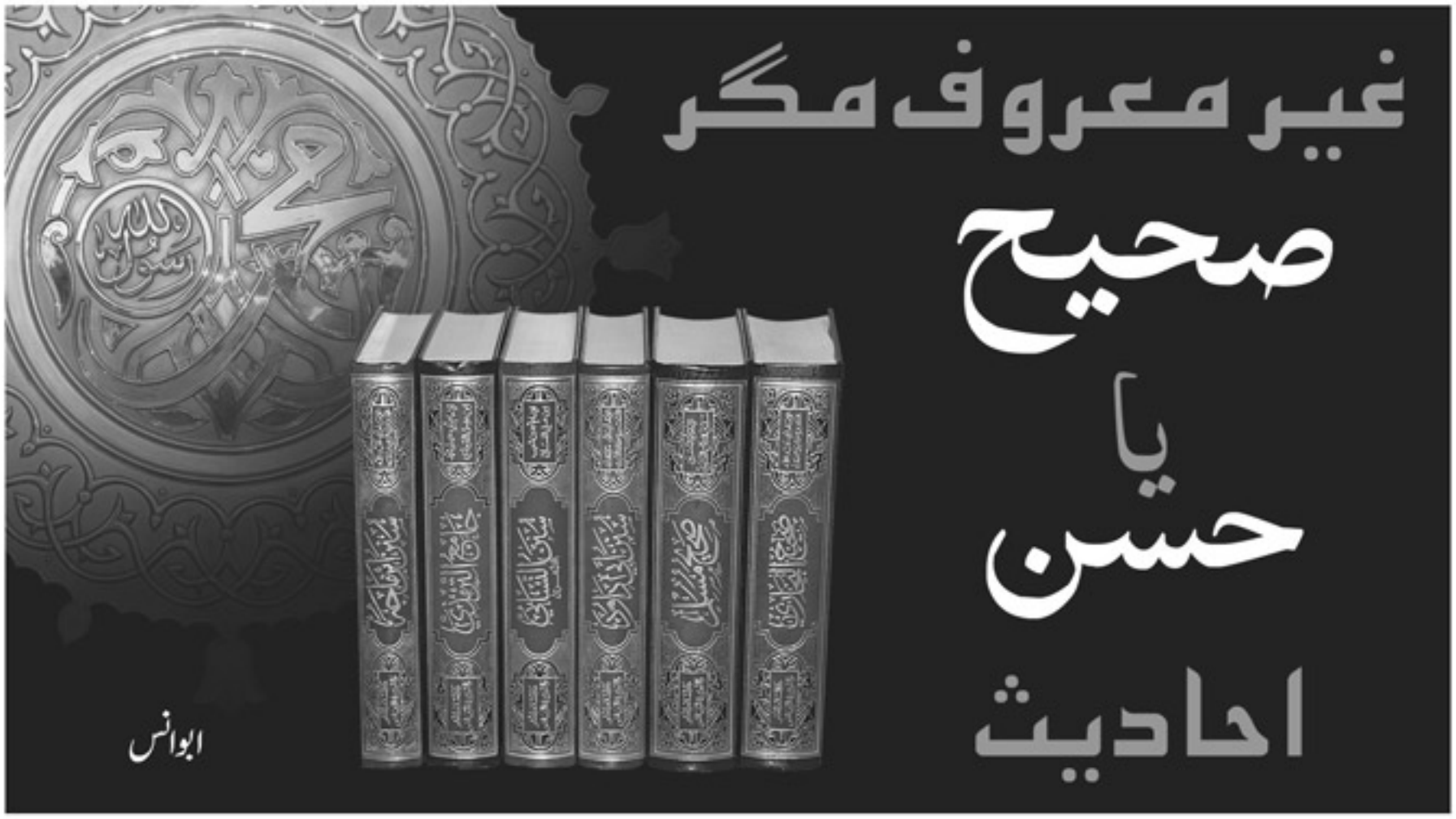
خلاصہ یہ کہ مشرکین کے نزدیک ان مقرب بارگاہِ الٰہی ہستیوں کی عبادت کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ وہ مشرکین کو اللہ کے قریب کر دیں اور دوسرے یہ کہ وہ اللہ سے کہہ سن کر ان کی مرادیں پوری کرا دیں اور ان کی حاجت روائی و مشکل کشائی ہو جائے۔ یعنی یہ ہستیاں اصل معبود نہ تھیں بلکہ اللہ اور بندے کے درمیان وسیلہ تھیں۔

اب تک قرآن مجید کی روشنی میں جو کچھ عرض کیا گیا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کو سب کچھ ماننے کے بعد پیغمبروں اور اولیائے کرام وغیرہ کو خدا کی عطا کی ہوئی کچھ خاص قوت و اختیار کا مالک، اللہ کی قربت کا وسیلہ اور اپنی مرادوں کی تکمیل اور حاجت روائی و مشکل کشائی کا ذریعہ سمجھ کر انھیں پکارتے تھے، ان سے فریادیں کرتے تھے اور انھیں خوش رکھنے کے لیے مختلف قسم کی نذر و نیاز پیش کرتے تھے۔ یہی مشرکین عرب کا شرک تھا۔ اس پر قرآن نے کڑی نکتہ چینی کی۔ اس کو مٹانے کے لیے پیغمبر ﷺ بھیجے گئے اور اللہ نے اس کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جس چیز کو چاہے گا بخش دے گا۔''
(النسآء 4:48)

پس ہر مسلمان کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ کہیں وہ خود تو اس میں مبتلا نہیں ہے، اگر مبتلا ہے تو فوراً توبہ کرنی چاہیے، ورنہ آخرت یقینی طور پر برباد ہو جائے گی۔

پہلا نمبر لیکن پیچھے سے

ابوالحارث کے پاس ایک خچر تھا، جو بہت لاغر تھا۔ ابوالحارث سے کسی نے پوچھا: ''کیا تمھارا یہ خچر کبھی دوڑ میں جیتا ہے؟ ابوالحارث نے کہا: ''ہاں، ایک دفعہ میں قافلے میں تھا کہ ہم ایک تنگ گلی میں داخل ہو گئے، جس سے نکلنے کا راستہ نہیں تھا۔ میں اپنی قوم کے آخر میں تھا، پھر جب وہ واپس ہونے لگے تو میں سب سے پہلے نمبر پر تھا۔'' (الکشکول، ص:1600)



① اگر آپ نگران ہیں؟

سیدنا خیثمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں ہم سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو ان کے خازن وہاں آئے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے ان سے پوچھا: کیا تم نے غلاموں کو ان کا کھانا پینا دے دیا ہے؟ وہ کہنے لگے: نہیں۔ انھوں نے کہا: ابھی انھیں دے کر آؤ۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كَفىٰ بِالْمَرْءِ إِثْماً أَنْ يَّحْبِسَ عَمَّنْ يَّمْلِكُ قُوْتَهُ» ''آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی روزی روکے رکھے۔'' (صحیح مسلم:996)

② حکمرانوں کی چوکھٹوں سے دور رہیں!

سیدنا ابو اعور سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِيَّاكُمْ وَ اَبْوَابَ السُّلْطَانِ فَإِنَّهُ قَدْ أَصْبَحَ صَعْبًا هَبُوطًا» ''حکمرانوں کی چوکھٹ سے دور رہو کیونکہ یہ کبھی بڑی مشکل اور رسوائی میں پھنسا دیتی ہے۔'' (السلسلة الصحيحة:3/2525، حديث:1253)

③ نفع بخش چیز کے حصول کی حرص!

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِحْرِصْ عَلىٰ مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجِزْ» ''جو بھی چیز آپ کو نفع دے اس کی بھرپور کوشش کریں اور اللہ سے مدد طلب کریں اور (اس کے حصول کے سامنے) بے بس نہ ہوں۔''
(صحیح مسلم: 2664)

③ قبر میں چٹائی وغیرہ بچھانا؟

سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے وصیت کرتے ہوئے فرمایا: .....تم میری لحد میں کوئی ایسی چیز نہ رکھنا جو میرے اور قبر کی مٹی کے درمیان حائل ہو اور نہ میری قبر پر کچھ تعمیر کرنا..... وہاں موجود لوگ پوچھنے لگے: کیا آپ نے اس بارے میں (رسول اللہ ﷺ) سے کچھ سنا ہے؟ وہ فرمانے لگے: جی ہاں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے۔
(مسند أحمد:4/397)

④ غصہ آئے تو.....؟

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: «وَإِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ» ''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے خاموشی اختیار کر لینی چاہیے۔''
(السلسلة الصحيحة:3/363، حديث:1375)



''محبت'' ایک ایسا لفظ ہے جو معاشرے میں بیشتر پڑھنے اور سننے کو ملتا ہے۔ اسی طرح معاشرے میں ہر فرد اس کا متلاشی نظر آتا ہے اگرچہ ہر متلاشی کی سوچ اور محبت کے پیمانے جدا جدا ہوتے ہیں۔ جب ہم اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات چڑھتے سورج کے مانند واضح ہوتی ہے کہ اسلام محبت اور اخوت کا دین ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ تمام لوگ محبت، پیار اور اخوت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ مگر قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں محبت کو غلط رنگ دے دیا گیا ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ''محبت'' کے لفظ کو بدنام کر دیا گیا ہے۔ صورت حال اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے حقیقی محبت کا اظہار کرنا چاہے تو وہ بھی تذبذب کا شکار رہتا ہے جبکہ اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ جس سے محبت ہو اس سے محبت کا اظہار بھی کیا جائے۔ (سنن أبي داود: 5124) اس تمام صورت حال کا سبب فقط اسلامی تعلیمات سے دوری ہے۔ اسلام نے محبت کی تمام راہیں متعین فرما دی ہیں۔ جہاں محبت کے لفظ کو بدنام کر دیا گیا ہے وہیں ہمارے معاشرے میں محبت کی بہت ساری غلط صورتیں بھی پیدا ہو چکی ہیں۔ اس کی ایک مثال عالمی سطح پر ''ویلنٹائن ڈے'' کا منایا جانا ہے۔ ہر سال 14 فروری کو یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے گفتگو کرنے سے پہلے ہم ''محبت'' کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں، اس لیے کہ ''ویلنٹائن ڈے'' کی حقیقت کو جاننے کے لیے اسلام کا ''معیارِ محبت'' اور اس کی ترتیب کو جاننا ضروری ہے۔

| اللہ تعالیٰ سے محبت |

قرآن و حدیث میں محبت کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اس میں سرفہرست بندوں کا اپنے رب سے محبت کرنا ہے۔ تمام کائنات سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت پر کسی اور شخص یا چیز کی محبت غالب نہیں آتی۔ مومنوں کی اس محبت کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ''اہل ایمان اللہ کے ساتھ محبت کرنے میں بہت سخت ہیں۔'' (البقرۃ 2:165) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ: أَنْ يَّكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيهِ مِمَّا



سِوَاهُما.....» ''تین چیزیں جس شخص میں پائی جائیں وہ ایمان کی مٹھاس محسوس کرنے لگتا ہے: ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اسے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں.....۔'' (صحيح البخاري: 16)

یہ ایک طبعی امر ہے کہ آدمی کو جس سے محبت ہو وہ اس سے ملاقات کا مشتاق بھی بہت ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی بات کو بیان فرمایا ہے: «مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَ هُ» ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کا خواہش مند ہوتا ہے۔''

(صحيح مسلم: 2683)

رسول اللہ ﷺ سے محبت

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی محبت ایمان کا حصہ ہے۔ ایک مسلمان کی کامیابی کا انحصار آپ ﷺ کی محبت کو قرار دیا گیا ہے۔ تمام کائنات سے بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت کا ہونا لازم اور ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ» ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کے ماں باپ اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

(صحيح البخاري: 14) ایک روایت میں ان الفاظ کا بھی اضافہ ہے: «وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ» ''جب تک تمام لوگوں سے بڑھ کر ان کے نزدیک محبوب نہ ہو جاؤں۔'' (صحيح البخاري: 15)

ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے قبولِ اسلام سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نبی ﷺ سے محبت کا اعتراف یوں کیا تھا: «مَارَأَيتُ فِي النَّاسِ أَحَداً يُحِبُّ اَحَدًا كَحُبِّ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ مُحَمَّداً» ''میں نے کسی کو کسی دوسرے سے ایسی محبت کرتے نہیں دیکھا جیسی محبت محمد (ﷺ) کے ساتھی اور شاگرد ان سے کرتے ہیں۔''

(تاريخ الطبري: 216/2)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت بھی ایمان کا حصہ ہے۔ قرآن و حدیث کی بہت ساری نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض وعناد رکھنا کفر و نفاق اور الحاد کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کو مسلمانوں کے لیے آئیڈیل قرار دیا ہے۔ نبی ﷺ نے بارہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہنے اور ان سے بغض رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے، خصوصاً انصار صحابہ کے بارے میں آپ ﷺ کا فرمان ہے: «اَلْاَنْصَارُ لَا يُحِبُّهُمْ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُهُمْ إِلَّا مُنَافِقٌ، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ أَحَبَّهُ اللّٰهُ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ أَبْغَضَهُ اللّٰهُ» ''مومن شخص ہی انصار سے محبت رکھتا ہے اور منافق ہی ان سے بغض رکھتا ہے۔ جو ان سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھے گا۔''

(صحيح البخاري: 3783)

میاں بیوی کی باہمی محبت

میاں بیوی کا آپس میں محبت کرنا شرعاً پسندیدہ اور مطلوب چیز ہے۔ دین اسلام اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ میاں بیوی آپس میں محبت کرنے کے بجائے غیروں سے محبت کی پینگیں بڑھاتے پھریں۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ میاں بیوی کا یہ پاکیزہ بندھن خوش حال زندگی کا باعث بنے، اسی لیے شریعت نے ان کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی بہت زیادہ تلقین کی ہے۔ ان حقوق میں سے ایک اہم حق ان کا آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کی باہمی محبت کو قرآن میں بیان فرمایا ہے: ﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ''اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے عظیم نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں۔'' (الروم 21:30) رسول اللہ ﷺ نے رفیقۂ حیات کے انتخاب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: «تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ» ''تم اس عورت سے شادی کرو جو محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی ہو۔ میں تمھاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔''

(سنن أبي داود: 2050)

والدین اور اولاد کی آپس میں محبت

والدین اور اولاد کے درمیان محبت کا ہونا



ایک فطری چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس محبت کے اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر غالب ہونے کی صورت میں سخت وعید فرمائی ہے، اس لیے کہ محبت کا پہلا حق اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ گو یا والدین اور اولاد کے مابین محبت شرعی طور پر مطلوب ہے مگر اس وقت جب اسے ثانوی حیثیت دی جائے اور اس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کو ترجیح حاصل ہو جیسا کہ بخاری کی مذکورہ بالا حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

عام افراد کی آپس میں محبت

اسلام امن و امان، اخوت اور محبت کا دین ہے۔ تمام لوگ معاشرے میں امن و امان اور محبت کے ساتھ پر سکون زندگی گزاریں، یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلامِ مقدس میں تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی قرار دیا ہے۔ گویا جس طرح سگے بھائیوں کے درمیان محبت ہوتی ہے اسی طرح تمام لوگوں سے محبت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن و حدیث میں مسلمانوں کے آپس میں محبت کرنے کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَا أَحَبَّ عَبْدٌ عَبْدًا لِلّٰهِ إِلَّا أَكْرَمَ رَبَّهُ عَزَّوَجَلَّ» ''جب کوئی بندہ کسی دوسرے سے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لیے محبت رکھتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے پروردگار کی تکریم کرتا ہے۔'' (مسند أحمد: 259/5) یہ محبت اسی صورت لائق تحسین ہے جب بغیر کسی لالچ اور طمع کے ہو۔

ویلنٹائن ڈے

عالمی سطح پر ''یومِ محبت'' کے طور پر ''ویلنٹائن ڈے'' کے نام سے منایا جانے والا یہ تہوار ہر سال پاکستان میں دیمک کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ اس دن جو بھی جس کے ساتھ محبت کا دعوے دار ہے اسے پھولوں کا گل دستہ پیش کرتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تہوار منانے والے ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر پائے کہ یہ دن منانے کی وجہ کیا ہے۔ اس حوالے سے مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ اگر ان روایات کو بھی بنیاد بنایا جائے تو ایک عقل مند اور باشعور انسان اس تہوار کو منانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کوئی بھی باغیرت اور باحمیت شخص کبھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ کوئی راہ چلتا شخص اس کی بیٹی کو پھولوں کا گل دستہ پیش کرتا پھرے۔ اسی طرح کوئی بھی باحیا، باغیرت اور پاکدامن لڑکی کبھی یہ پسند نہیں کرے گی کہ اس کا کلاس فیلو، یونیورسٹی فیلو یا کوئی بھی راہ چلتا نوجوان اسے پھول پیش کرے اور محبت کی پینگیں بڑھائے۔

ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ اس دن کے حوالے سے مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں جن میں سے کوئی مستند نہیں ہے، البتہ ایک خیالی داستان جو اس حوالے سے بہت مشہور ہو چکی ہے، اسے بطور مثال ذکر کرتے ہیں: تیسری صدی عیسوی میں روم میں ''ویلنٹائن'' نامی ایک پادری کو ایک راہبہ سے ''عشق'' ہو گیا۔ عیسائیت میں راہبوں اور راہبات کے لیے نکاح ممنوع تھا اور اب بھی ممنوع ہے۔ اس نے عشق کو انتہا تک پہنچانے کے لیے ایک ڈرامہ رچایا اور اپنی معشوقہ سے کہا: ''مجھے خواب میں بتایا گیا ہے کہ اگر 14 فروری کو راہب اور راہبہ (بغیر نکاح کے) صنفی ملاپ کر لیں تو ان پر کوئی حد نہیں لگے گی۔'' راہبہ اس کے چکر میں آ گئی اور دونوں ''جوشِ عشق'' میں ''منہ کالا'' کر بیٹھے۔ کلیسا کی روایات کی یوں دھجیاں اڑانے پر انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس پادری کا نام ''ویلنٹائن'' بتایا جاتا ہے جسے بعد میں ''عشاق'' کی طرف سے ''شہیدِ محبت'' کا لقب دیا گیا۔ اسی عاشق راہب ویلنٹائن کی یاد میں ہر سال 14 فروری کو ''ویلنٹائن ڈے'' منایا جاتا ہے۔

یہ وہ داستان ہے جس کی بنیاد پر ایک جنونی گروہ مسلم معاشرے خصوصاً پاکستان میں بے حیائی کو فروغ دے رہا ہے۔ باعثِ شرم بات تو یہ ہے کہ اس عاشق راہب اور معشوقہ راہبہ کا جس مذہب سے تعلق تھا وہ اس تہوار کو اپنا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں مگر مسلمان ہیں کہ بے حیائی کے اس کلچر کو دل و جاں سے قبول کیے ہوئے ہیں۔ باعثِ صد افسوس بات یہ ہے کہ ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر چھایا ہوا ایک مخصوص گروہ ''ویلنٹائن ڈے'' کو یومِ تجدید محبت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ماضی قریب تک ایسی ''محبت'' کو باعث عار سمجھا جاتا تھا مگر اب اسے باعث افتخار سمجھا جانے لگا ہے۔ ایک وقت تھا کہ اگر کسی کو عشق کی بیماری لگ جاتی تو وہ معاشرے میں اپنی عزت کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے اس مرض کو ظاہر نہیں کرتا



تھا۔ مگر آج وطن عزیز میں صورت حال یہ بن چکی ہے کہ ہمارا میڈیا اس مرض کو ایک ''مقدس شے'' کے طور پر پیش کرتا ہے۔ پاکستان میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ویلنٹائن جیسی واہیات تقریبات کو رواج دیا جا رہا ہے۔ اسلام کے نام پر بننے والی اس مملکت خداداد میں لادینیت اور جنسی بداعتدالیوں کو کس طرح تیزی سے پروان چڑھایا جا رہا ہے اس کا اندازا اس طرح کے حیا باختہ تہواروں سے باآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ غیر مسلم این۔ جی۔ اوز کے تحت چلنے والے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باقاعدہ طور پر اس بے ہودہ تہوار کو منایا جاتا ہے۔ یقیناً ان سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے ہمارے ہی بچے، ہماری ہی بیٹیاں اور بہنیں ہوتی ہیں جن کو دنیاوی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ دین سے دور بھی لے جایا جا رہا ہے۔ گلی کوچوں، محلوں، بازاروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لفنگے نوجوان ان با حیا اور شریف لڑکیوں کو پھول پیش کر کے چھیڑ خانی کرتے رہتے ہیں جو اپنے آپ کو مغربی تہذیب سے محفوظ رکھنا چاہتی ہیں۔ عفت وعصمت کی پیکر یہ لڑکیاں اس بداخلاقی کا جواب دینے کے بجائے عزت بچا کر وہاں سے بچ نکلنے ہی میں عافیت سمجھتی ہیں۔

فحاشی اور بے حیائی کے اس تہوار کو ''یومِ محبت'' قرار دیے جانے کے بجائے ''یومِ اوباشی'' قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، اس لیے کہ اس تہوار کا اصل مقصود مرد اور عورت کے درمیان ناجائز تعلقات کو فروغ دینا بلکہ تقدس عطا کرنا ہے۔ اہل مغرب کی یہ کوشش ہے کہ اسلامی معاشرے میں فحاشی وعریانی کو عام کر کے مغربی ممالک کی طرح یہاں بھی عورت کو ''تماشا'' بنا دیا جائے۔ قدیم رومی کلچر کی روایات ہوں یا جدید مغرب کا اسلوبِ جنس پرستی، ان کا ہماری مذہبی تعلیمات تو ایک طرف، مشرقی کلچر سے بھی دور کا واسطہ نہیں ہے۔ مغرب میں ''محبت'' کا تصور ومفہوم یکسر مختلف ہے۔ جس جذبے کو وہاں محبت (LOVE) کا نام دیا جاتا ہے، وہ درحقیقت بوالہوسی اور خواہش پرستی ہے۔ اس معاشرے میں عشق اور فسق میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ مرد وزن کی باہمی رضا مندی، ہر طرح کی شہوت رانی اور زنا کاری وہاں ''محبت'' ہی کہلاتی ہے۔ اسی طرح ''ویلنٹائن ڈے'' منانے والوں کی جانب سے ''محبت'' کا لفظ جنسی بے راہ روی کے لیے بطورِ استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ گویا ''حقیقی محبت'' اور ''ویلنٹائن ڈے'' دو متضاد چیزیں ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''حقیقی محبت'' دین اسلام کا حصہ اور ''ویلنٹائن ڈے'' جنسی بے راہ روی کا دوسرا نام ہے۔

قدیم روم میں اس تہوار کو ''خاوند کے شکار'' کا دن سمجھا جاتا تھا، یعنی عورت خود ہی بازار میں نکلتی اور اپنے ہونے والے شوہر کا خود ہی انتخاب کرتی۔ اسلام اس بے حمیتی کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی معاشرے میں عورت کی شادی کی ذمہ داری اس کے ولی کی ہے۔ ولی کی اجازت کے بغیر عورت کے اس نکاح کو شریعت نے زنا قرار دیا ہے۔ اسی طرح اسلام میں میاں بیوی کے درمیان محبت کے اظہار پر کوئی بندش نہیں ہے لیکن اس کے لیے ایک ایسے دن کا انتخاب کرنا جو مغرب کی جنس پرست تہذیب کا علامتی اظہار بن چکا ہے، کسی بھی اعتبار سے مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ نہایت افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمارے ہاں نوجوان نسل کو ان خرافات کے مضمرات سے آگاہ نہیں کیا جا رہا۔ انھیں اس بات سے مطلع نہیں کیا جا رہا کہ جس بات کو وہ ''محبت'' سمجھ کر منا رہے ہیں، وہ درحقیقت شہوت رانی اور جنسی بے راہ روی کی علامت ہے۔ اس کا ان کی سماجی روایات اور اخلاقی قدروں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

بے حیائی پر مبنی یہ تہوار جس تیزی کے ساتھ پاکستان میں پھیلتا جا رہا ہے وہ بہت تشویشناک ہے۔ اخباری رپورٹ کے مطابق صرف لاہور کے اندر گزشتہ سال 14 فروری کو کروڑوں روپے کے پھول فروخت ہوئے۔ اس قدر بڑی مقدار میں پھول بوالہوس عُشاق کی طرف سے ایک دوسرے کو پیش کرنے کے لیے خریدے گئے۔ اس تمام صورتِ حال کا ذمہ دار ہمارا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ہے۔ کیا ہمارے ذرائع ابلاغ کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ محض خبروں کی سنسنی خیز اشاعت کے ساتھ ساتھ ایسے مسائل میں پاکستانی قوم کی رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کریں؟ ہر سال ''ویلنٹائن ڈے'' کے نام سے بے شمار قیمتی اشتہار شائع کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح الیکٹرانک میڈیا پر



''ویلنٹائن ڈے'' کے حوالے سے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ اوباش نوجوانوں کی طرف سے شریف لڑکیوں کے نام پیغام نشر کیے جاتے ہیں، اسی طرح کچھ ''روشن خیال'' نوجوان لڑکیاں بھی اپنے عاشقوں کے نام پیغام نشر کرواتی ہیں۔ گویا جس طرح ہمارا میڈیا بے حیائی کے اس کلچر کو کوریج دیتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بے حیائی کے اس پروگرام کو پھیلانے میں مغربی ممالک کی طرف سے میڈیا کو خاص ہدف سونپا گیا ہے۔

بے حیائی کو فروغ دینے میں موبائل فون کمپنیاں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایسے موقع پر ان کمپنیوں کی طرف سے بھی عجیب وغریب قسم کے ایس۔ ایم۔ ایس بھیجے جاتے ہیں۔ ٹاک میسجز اور کالر ٹونز کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔

روزنامہ جنگ لاہور: 15 فروری 2012ء کے مطابق گزشتہ سال سیاستدانوں میں سے بھی اکثریت نے بے غیرتی کے اس کلچر میں پورا پورا حصہ لیا۔ انھوں نے بھی خوب جوش و خروش سے ویلنٹائن ڈے منایا اور اس بات کا ثبوت دیا کہ ہمارا تعلق ''محمد رسول اللہ ﷺ'' سے نہیں بلکہ جنسی بے راہ روی کے علمبردار مسیحی راہب ''ویلنٹائن'' سے ہے۔ صاحب اقتدار طبقے کی اس روش پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔

حکومت وقت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نوجوانوں کو لہو ولعب اور جنسی بے راہ روی سے بچانے کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ ویلنٹائن ڈے کے موقع پر گلاب کے پھول اور کارڈز کی خرید وفروخت پر پابندی عائد کرے۔ اخبارات کے مالکان کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے کسی قسم کے اشتہارات اور پیغامات شائع نہیں کریں گے۔ ویلنٹائن ڈے اور اس جیسی بے ہودہ سرگرمیاں جو اسلامی اخلاقیات کا جنازہ نکال دیں، ان کے متعلق حکومت کو خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کرنا چاہیے۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے بھی گزارش ہے کہ وہ ہوش کے ناخن لیں۔ نئی نسل کی جنسی آوارگی کی طرف رہنمائی کرنے کے بجائے ان کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ انھیں اس بات سے آگاہ کریں کہ جس راہ پر تم چل نکلے ہو اس کے نتائج بہت خطرناک ہیں۔

تعلیمی اداروں کے منتظمین اور اساتذہ کرام کے نام بھی یہ پیغام ہے کہ تعلیم کے حصول کے لیے آنے والے بچے آپ کے پاس امانت ہیں۔ والدین اپنے بچوں کو کسی سکول، کالج یا یونیورسٹی بھیجتے ہیں تو ان کا مقصود ان کو اچھی تعلیم دلوانا ہوتا ہے نہ کہ ان کے اخلاق کا جنازہ نکلوانا۔ اب آپ کا یہ فرض بنتا ہے کہ سکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والی نئی نسل کی اخلاقی تربیت کریں۔ انھیں حیا باختہ تہواروں کے بارے میں آگاہ کریں کہ ہمارے مذہب اور ہماری معاشرتی اقدار کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب یورپی تہذیب ہے جو ہمارے صاف ستھرے چہرے کو مسخ کرنا چاہتی ہے۔

حکومت، میڈیا اور تعلیمی اداروں کے منتظمین و اساتذہ کے ساتھ ساتھ والدین کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کریں۔ انھیں ان بے ہودہ تہواروں سے لاتعلق رہنے کی تلقین کریں اور ان دنوں ان کی خصوصی نگرانی بھی کریں کہ کہیں وہ شیطان کے جال میں پھنس کر کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔

یاد رکھیں! اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور تمام ذمہ داران اخلاقیات کے دشمن ان تہواروں سے صرفِ نظر کرتے رہے تو آج مغرب جس صورتِ حال سے دوچار ہے وطنِ عزیز میں اس کے پیدا ہونے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ یورپ حیا سے عاری ان تہواروں کے نتائج دیکھ چکا ہے۔ اگر ان حیا سوز تہواروں کے آگے بند نہ باندھا گیا تو ہم بھی اس عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔ یورپ میں بھی یہ سب کچھ ایک سال میں نہیں ہو گیا تھا، ان کے ہاں بھی خاندانی نظام کی تباہی اور جنسی انقلاب آہستہ آہستہ وقوع پذیر ہوا تھا۔ یورپ کے دانشور خاندانی نظام کی بحالی کی دہائی دے رہے ہیں مگر اب پانی ان کے سروں سے گزر چکا ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت محض ایک قلیل تعداد اس خطرناک اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہوئی ہے، ہماری آبادی کی اکثریت اس آگ کی تپش سے اب تک محفوظ ہے۔ ابھی وقت ہے کہ آگے بڑھ کر چند جھاڑیوں کو لگی آگ کو بجھا دیا جائے، ورنہ یہ آگ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی.....!!!



نحمده و نصلی علیٰ رسوله الکریم. اما بعد!

بدلتے موسموں کی طرح انسانی زندگی میں مختلف مواقع آتے رہتے ہیں کبھی خوشی، کبھی غم۔ ہر موسم اپنی مستقل افادیت کا حامل ہوتا ہے، مثلاً: خزاں، بہار، سردی، گرمی۔ موسموں کی یہی تبدیلی ماحول کو خوشگوار بناتی ہے۔ اسی طرح انسانی کیفیات میں تبدیلی، مختلف نشیب وفراز، انسان کو منجھا ہوا (Mature) بنا دیتے ہیں۔

قدرت کا قانون بھی کس قدر شاندار ہے کہ سورج، چاند مختلف حالتوں سے دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔ نہ رات کو مستقل بنایا گیا اور نہ دن کے اجالوں کو راج دیا گیا۔

یہ قدرتی تبدیلیاں ہر دکھی، پریشان اور مصیبت زدہ انسان کے لیے مرہم پٹی اور خوشیوں میں گم، مال کی ریل پیل میں بہنے والے کے لیے مقامِ تنبیہ ہے کہ ہمیشہ یہی حالت نہیں رہنی۔

کسی دانا سے پوچھا گیا: کوئی ایسا جملہ بتائیں جو پریشان آدمی سنے تو اس کی پریشانی جاتی رہے اور کوئی خوشی کے عالم میں سنے تو اس کی خوشی ماند پڑ جائے؟ انھوں نے بہت خوب جواب دیا: ''یہ وقت بھی گزر جائے گا۔''

اسی طرح معاشی میدان میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی نفع اور کبھی خسارہ۔

انسان فطرتاً نفع حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کے لیے کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سوچ بچار کرتا ہے۔ نقصان کے اسباب سے بچتا ہے اور نفع کے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ حقیقی اسباب کی طرف توجہ نہیں جاتی۔ جن سے حقیقت میں بے برکتی اور خسارہ پیش آتا ہے۔

ذیل میں ایسے اسباب کا ذکر کیا جائے گا جو نفع حاصل کرنے اور خسارے سے بچنے کے لیے نہایت مفید اور معاون ہیں:

| نقصان کے اسباب |

کاروبار میں خسارے کے مادی اسباب تو عموماً سامنے آ جاتے ہیں، مثلاً: مینجمنٹ کی غفلت، اہل کاروں کی کوتاہی، مارکیٹ کا اتار چڑھاؤ، حالات کا ناسازگار ہونا، موسم کی تبدیلی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقی اسباب عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان مادی اسباب کے ساتھ ساتھ درج ذیل اسباب کا بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے:

① سودی کاروبار کرنا

سودی کاروبار سے برکت ختم ہو جاتی ہے اور کاروبار خسارے میں پڑ جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِى الصَّدَقٰتِ﴾ ''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقے کو بڑھاتا ہے۔'' (البقرة 2: 276)

② سودا بیچتے ہوئے جھوٹی قسم کھانا

عموماً تاجروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، حالانکہ اس سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت



ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''قسم سے سودا پک جاتا ہے مگر برکت اٹھ جاتی ہے۔'' (سنن أبي داود: 3335)

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا نہ ہی ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ بدنصیب اور خسارے والے کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(صدقہ کرکے) احسان جتلانے والا، تہبند (شلوار، چادر ٹخنوں کے نیچے) لٹکانے والا اور جھوٹی قسم کھا کر اپنا سامان فروخت کرنے والا۔'' (جامع الترمذي: 1211)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے جھوٹی قسم کھائی تاکہ وہ کسی مسلمان کا مال ہڑپ کر جائے تو ایسا شخص جب اللہ تعالیٰ سے ملے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا۔'' (جامع الترمذي: 1269)

③ خیانت سے کام لینا

ایک مسلمان کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی سے دھوکہ دہی اور خیانت سے کام نہیں لیتا بلکہ نہایت امانت دار ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میں دو شریکوں (ساجھے داروں) کا تیسرا ہوں جب تک ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی خیانت نہ کرے۔ جب کوئی خیانت کرتا ہے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔'' (سنن أبي داود: 3383)

اس میں امانت و دیانت کی تاکید و اہمیت ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ کا درمیان سے نکل جانا بطور استعارہ کے ہے، یعنی برکت اٹھ جاتی ہے۔ اور ایک روایت کے مطابق شیطان ان کے درمیان داخل ہو جاتا ہے۔

④ فریب اور دھوکہ دینا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غلے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے۔ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس میں داخل کیا تو انگلیوں کو تری لگ گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''اے غلے والے! یہ کیا؟'' وہ کہنے لگا: اللہ کے رسول! اس پر بارش پڑ گئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو نے اسے ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔'' (جامع الترمذي: 1315)

⑤ مسجد میں خرید و فروخت کرنا

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد میں (کوئی چیز) فروخت کر رہا ہے یا خرید رہا ہے تو اسے کہہ دو: ''اللہ تیری تجارت کو نفع مند نہ بنائے۔'' (جامع الترمذي: 1321)

⑥ جوا کھیلنا

اسلام میں جوا کھیلنے اور اپنے مال کو ضائع کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ ''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب، جوا، تھان اور پانسے کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔'' (المآئدة 90:5)

⑦ رشوت لینا اور دینا

رشوت لینے اور دینے سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔
(مسند أحمد: 164/2)

احتیاطی تدابیر

کاروبار میں اضافے کے لیے کئی اسباب کارفرما ہوتے ہیں، مثلاً: مینجمنٹ کی ذہانت، اہل کاروں کی چستی، منڈی اور حالات کا موافق ہونا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ تجارت میں سب سے زیادہ اضافے اور برکت کا باعث بننے والے چند اسباب درج ذیل ہیں:

① شبہات سے بچنا

جو چیزیں بعض وجوہ سے ناجائز اور بعض دوسرے وجوہ سے ان کے حلال ہونے کا بھی امکان ہو اور معاملہ صاف اور واضح نہ ہو تو اس سے



بچنا چاہیے کہ کہیں حرام کا ارتکاب نہ ہو جائے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان کے درمیان کئی امور شبہے والے ہیں۔'' اور دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حلال اور حرام کے درمیان کچھ شبہے والی چیزیں ہیں، جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے، پس جو شبہات سے بچ گیا تو اس نے اپنی عزت اور دین کو محفوظ کر لیا اور جو شبہے والی چیزوں میں جا پڑا وہ حرام میں داخل ہوا۔'' (سنن أبي داود: 3329 و3330)

② مال سے صدقہ کرنا

صدقہ کرنے سے مال میں بے پناہ برکت اور اضافہ ہوتا ہے ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِى الصَّدَقٰتِ﴾ ''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقے کو بڑھاتا ہے۔'' (البقرة2: 276) حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین باتوں پر میں قسم کھاتا ہوں اور تم سے ایک بات کرتا ہوں، اسے یاد رکھو:

① صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا۔

② جس پر ظلم کیا جائے وہ اس ظلم پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھا دیتا ہے۔

③ جس نے اپنے لیے سوال (لوگوں سے مانگنے) کا دروازہ کھول لیا تو اللہ تعالیٰ اس پر غربت کا دروازہ کھول دے گا۔''

(جامع الترمذي: 2325)

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے تاجروں کی جماعت! بلاشبہ شیطان اور گناہ دونوں خرید و فروخت کے (وقت) حاضر ہوتے ہیں۔ لہٰذا تم اپنی بیع کو صدقہ کے ساتھ ملا دیا کرو (صدقہ کیا کرو۔)''

(جامع الترمذي: 1208)

③ ناپ تول میں کمی نہ کرنا

ناپ تول میں احتیاط کرنی چاہیے۔ ناپ تول میں کمی کرنے والے کے لیے سخت وعید آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ o الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ o﴾ ''بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انھیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔'' (المطففين 83:1,2)

حدیث میں ہے: ''جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو اس پر قحط سالی، سخت محنت اور حکمرانوں کا ظلم مسلط کر دیا جاتا ہے۔''

(سنن ابن ماجه: 4019)

اسلام کی تعلیم کتنی خوبصورت ہے۔ ناپ تول میں کمی کرنا تو دور کی بات ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «زِنْ وَ أَرْجِحْ» ''وزن کر اور جھکتا ہوا تول۔'' (جامع الترمذي: 1305)

④ تجارت میں عیب کو چھپانے اور جھوٹ سے اجتناب کرنا

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر بائع اور مشتری دونوں سچ بولیں اور (معاملے کو) واضح کر دیں تو ان کی بیع میں برکت ہو گی۔ اور اگر انھوں نے جھوٹ بولا اور (عیب کو) چھپایا تو اس بیع سے برکت ختم کر دی جائے گی۔'' (صحيح البخاري: 2110)

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر انھوں نے عیب چھپایا اور جھوٹ سے کام لیا تو ممکن ہے انھیں کچھ نفع حاصل ہو جائے لیکن اس میں برکت نہ رہے گی۔'' (صحيح البخاري: 2114)

⑤ تجارت کے لیے صبح سویرے نکلنا

رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! میری امت کے لیے اس کی صبح میں برکت عطا فرما۔'' (جامع الترمذي: 1212)

سیدنا صخر رضی اللہ عنہ تاجر آدمی تھے۔ آپ جب اپنے کارندوں کو تجارت کی غرض سے کہیں بھیجتے تو صبح سویرے روانہ کرتے، جس سے ان کے مال میں خوب برکت ہوئی اور وہ کافی دولت مند ہو گئے۔ (جامع الترمذي: 1212)

⑥ اپنے فقر و فاقہ، حالات کی تنگی لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس آدمی پر فقر آیا اور اس نے لوگوں سے بیان کیا تو اس کا فاقہ ختم نہیں ہو گا اور جس آدمی نے لوگوں کی بجائے اللہ کے سامنے اپنے حالات کو بیان کیا (اور اسی سے مدد طلب کی) تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جلدی رزق دے یا کچھ تاخیر سے۔'' (جامع الترمذي: 2326)



⑦ اسراف اور فضول خرچی سے بچنا

فضول خرچ کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ انسان جب اپنے مال اور کاروبار میں احتیاط سے کام لیتا ہے، اسے فضول ضائع نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے مال میں برکت دے گا اور فضول خرچی سے مال ضائع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰبَنِيٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ ''اے اولاد آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنے آپ کو آراستہ کر لیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور اسراف مت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (الأعراف 31:7)

حقیقی کامیابی

کامیاب تاجر وہ کہلاتا ہے جو نفع کا موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دے اور نقصان سے بچتا رہے۔ حقیقی نفع یہی ہے کہ آدمی دنیا کے عارضی نفع کے ساتھ آخرت کے دائمی نفع کو نظر انداز نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ ''بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں جہنم کے عذاب سے نجات دے۔'' (البقرة 201:2)

حقیقت یہی ہے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''آخرت کے مقابلے میں دنیا کی صرف اتنی حیثیت ہے کہ تم میں سے کوئی دریا میں ہاتھ ڈال کر نکال لے اور دیکھے کہ اس کے ساتھ کتنا پانی آتا ہے۔'' (جامع الترمذي:2333)

دنیا مومن آدمی کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کے دائمی فوائد حاصل کرنے کے چند اسباب اور ذرائع درج ذیل ہیں:

① تنگ دست کو مہلت دینا یا معاف کر دینا

حدیث میں ہے کہ ''جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دیتا ہے یا اس کا قرض معاف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اپنے عرش کے سایہ کے نیچے جگہ دے گا کہ جس دن صرف اسی کا سایہ ہوگا۔''
(جامع الترمذي:1306)

② سچائی اور امانت و دیانت کا مظاہرہ کرنا

اس کا اہتمام کیا جائے کہ معاملات میں سچائی، ستھرائی اور دیانت داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص تیرے پاس امانت رکھے تو اس کی امانت ادا کر اور جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر۔''
(جامع الترمذي: 1264)

دوسری حدیث میں ہے کہ ''سچا اور امانت دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔'' (جامع الترمذي: 1209)

آپ ﷺ نے لوگوں کو خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھا تو تاجروں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''تاجروں کو روز محشر گناہ گار اٹھایا جائے گا، سوائے اس کے جو اللہ سے ڈر گیا، اس نے نیکی کی اور سچ بولا۔''
(جامع الترمذي:1210)

یاد رکھیے! آج ہمارا معاشرہ نیک، دیانت دار اور سچے تاجروں کو ترستا ہے۔ جب تاجر کے دل میں رحم ہوتا ہے، دیانت و شرافت اور اعلیٰ پاکیزہ صفات ہوتی ہیں تو وہ تاجر نہ صرف اپنے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے سنہرا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔ آج معیشت کے میدان میں دور دور تک خود غرضی، حرص دنیا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، حالانکہ تجارت نہایت پاکیزہ مشغلہ ہے جس میں انسانیت کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنا روزگار بھی ہے۔ انسان کا لالچ کبھی ختم نہیں ہوتا، بڑھتا ہی رہتا ہے، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''اگر ابن آدم کے لیے سونے کی ایک وادی بھی ہو تو وہ دوسری کی تمنا کرتا ہے اور کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اس کے پیٹ کو مٹی ہی بھرے گی۔'' (صحيح البخاري:6436)

اگر ہم تجارت اسلامی طریقوں پر کریں، نفع کم ہو یا زیادہ، سیل بڑھے یا نہ بڑھے، اللہ کی قسم! اس میں برکت ہوگی اور ایک سو روپیہ برکت والا بے برکتی کے اربوں سے بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو رزق حلال وافر عطا فرمائے اور ہمیں اسلامی نقطۂ نظر سے سوچنے سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین.



جب پاکستان قائم ہوا تو ریاست جموں و کشمیر پر ڈوگرا حکمران قابض تھے جن کا عہد حکومت ایک سو سال پر محیط ہے۔ غاصب و قابض حکمرانوں کا اپنی رعایا پر ظلم وستم اور نفرت کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے لیکن جو نفرت ڈوگرا حکمرانوں نے اپنی کشمیری رعایا سے کی اور ظلم کے جو پہاڑ توڑے اس کی مثالیں تاریخ میں کم ہی ملتی ہیں۔ ڈوگروں کی اپنی رعایا سے انتہا درجے کی نفرت کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ مذہباً ہندو تھے اور ان کی رعایا مسلمان تھی۔ مسلمانوں سے نفرت ان کے مذہب کا حصہ تھی۔ ڈوگرے حکمران مسلمانوں کے وجود کو بھی اپنے لیے ناقابل برداشت سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک کسی مسلمان پر صبح صبح نظر پڑ جانا بدشگونی کا باعث سمجھا جاتا، ایسے مسلمان کو سخت تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اور بعض کو قابل گردن زدنی قرار دیا جاتا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے پینے کے لیے جو پانی شاہی چشمہ سے لایا جاتا، اس کے بارے میں خصوصی اہتمام کیا جاتا کہ اس پر کسی مسلمان کی نظر نہ پڑے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ پانی ناپاک سمجھا جاتا اور جس مسلمان کی نظر اس پانی پر پڑ جاتی اس کو سخت تشدد کا نشانہ بنانے کے علاوہ قید کر لیا جاتا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عام حالات میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ملاقات کرنا اپنے لیے باعث نحوست سمجھتا تھا۔ اس کی مسلمانوں سے نفرت و دشمنی اور عداوت کی یہ کیفیت تھی کہ وہ جب بیمار پڑا تو اس کے علاج کے لیے دہلی سے حکیم محمود خان کو بلایا گیا۔ اتفاق سے حکیم محمود خان صبح صادق کے وقت مہاراجہ کے محل پہنچا لیکن اسے مہاراجہ کے پاس اس وجہ سے نہ جانے دیا گیا کہ مہاراجہ صبح سویرے کسی مسلمان سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ سہ پہر کے وقت حکیم محمود خان کو مہاراجہ کا معائنہ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس وقت اس کی حالت اتنی بگڑ چکی تھی کہ وہ جانبر نہ ہوسکا۔ یقیناً حکیم محمود خان کو مہاراجہ یا اس کے قریبی عزیز یا کسی قریبی ساتھی نے بغرض علاج دہلی سے طلب کیا ہوگا۔ ایسے معزز مہمان سے جانکنی کے عالم میں بھی مہاراجہ کی نفرت کی یہ شدت تھی تو عام حالات میں وہ اپنی رعایا سے جو نفرت بھرا سلوک کرتا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

کشمیر میں کوئی خاص صنعت وحرفت نہ تھی اور نہ ہی ہندو حکمرانوں کو اپنی ریاست میں ترقیاتی کام کروانے میں کوئی خاص دلچسپی تھی۔ ان کی ساری دلچسپی محاصل اکٹھے کرنے تک تھی۔ ریاست میں افرادی قوت کے تین بڑے طبقے تھے: کسان، مزدور اور دستکار۔ ڈوگرا حکمرانوں کی آمدنی کا تمام تر دارومدار ان تمام طبقات پر عائد شدہ محاصل پر تھا۔ محاصل ظالمانہ ہی نہیں بلکہ مسلم کش بھی تھے۔ انگیٹھیوں، چولہوں، جانوروں اور بیویوں پر ٹیکس لگائے جاتے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان تازہ ہوا کے لیے کھڑکی رکھتا تو اس پر بھی ٹیکس لگتا، چنانچہ مسلمان مکان تعمیر کرتے وقت کھڑکیاں نہ رکھواتے اور ٹیکس سے بچنے کے لیے صرف ایک چولہا تعمیر کیا جاتا۔ رابرٹ تھارپ



اپنی کتاب Missfit Government in Kashmer میں لکھتا ہے: ''جو کچھ کسان اگاتا ہے اس میں راجہ سے لے کر معمولی ہرکارہ تک ہر ایک بتدریج حصہ دار ہے۔ تحصیلدار، تھانیدار، کاردار، مقدم، پٹواری، شکردر، سرگول، ترگ دار، اور ایسے ہی دوسرے سرکاری و نیم غیر سرکاری کارندے غریبوں کا خون چوس رہے ہیں۔ اناج کا سالانہ ٹیکس، میوہ ٹیکس، مویشی ٹیکس، تھوڑوں کا ٹیکس اور نقد آور اشیاء، مثلاً: دودھ، تیل، مرچ، مکھن وغیرہ پر بھی ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ شال بافی پر مامور شال باف خواہ اندھا ہو جائے وہ اس وقت تک چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنی جگہ دوسرا آدمی مہیا نہ کردے۔ شال باف کی حیثیت یرغمال کی سی ہے چاہے وہ بیمار ہو جائے یا موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ اسے کارخانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی جو لوہے کی سلاخوں سے بنی ہوئی ہے چھوڑنے کی اجازت نہیں مل سکتی اور وہ کھلی ہوا میں سانس لینے کا بھی حقدار نہیں۔''

ہندو حکمرانوں کے نزدیک کسی کشمیری پر تشدد کے لیے اس کا مسلمان ہونا ہی کافی تھا۔ ہندو حکمرانوں نے اپنے سو سالہ اقتدار کے عرصہ میں اپنی مسلمان رعایا کی خوب نسل کشی کی۔ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے، مساجد و مدارس کو تالے لگائے گئے اور بے شمار مساجد و مدارس کو شہید کیا گیا، ہندو حکمرانوں کے دور میں مسلمانوں کے لیے دنیوی تعلیم کے حصول کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ دینی تعلیم کے حصول پر بھی پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ 1920ء میں وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ نے ریاست جموں و کشمیر کا دورہ کیا تو یہاں کے مسلمانوں نے اس کو جو اپنے مطالبات پر مشتمل یاداشت پیش کی اس میں دو یہ مطالبے بھی شامل تھے:

① مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کے حصول کی سہولت دی جائے۔

② مساجد اور دیگر مذہبی مقامات واگزار کیے جائیں۔

وائسرائے نے مسلمانوں کی یاداشت مہاراجہ تک پہنچائی۔ مہاراجہ اس وقت تو خاموش رہا بعد میں یاداشت پیش کرنے والے وفد کے دو اراکین خواجہ سعد الدین شال اور خواجہ شاہ نور نقشبندی کو ریاست بدر کر دیا گیا اور دیگر اراکین وفد خواجہ مقبول پنڈت، میر واعظ مولوی احمد اللہ، میر واعظ ہمدانی اور سید حسن شاہ گیلانی کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ متذکرہ بالا حقائق و واقعات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ڈوگرا حکمرانوں نے اپنی رعایا سے صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ظالمانہ، سفاکانہ، بہیمانہ اور منتقمانہ سلوک روا رکھا۔

ریاست جموں و کشمیر کی سیاست میں تبدیلی کے آثار اس وقت پیدا ہونا شروع ہوئے جب ہٹلر کی مہم جوئی نے برصغیر کی سیاسیات پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کے نتیجہ میں ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں میں بھی بیداری کی لہر پیدا ہوئی اور وہ ڈوگرا حکمرانوں کے مظالم کا جواب جذبہ ایمان اور غیرت اسلامی سے دینے لگے۔ بعدازاں یہی جذبہ تحریک آزادی کشمیر کی بنیاد بنا۔ اس پس منظر میں ریاست جموں و کشمیر میں آزادی کی جو تحریک چلی اس پر اسلام کی گہری چھاپ تھی اور آج بھی اسلام کی چھاپ اسی طرح گہری ہے اس میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔

1930ء میں ریاست جموں و کشمیر میں تین شخصیات نمودار ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ریاست کے سیاسی افق پر چھا گئیں۔ ان میں سے ایک چوہدری غلام عباس، دوسرے شیخ عبداللہ اور تیسرے میر واعظ مولانا محمد یوسف ہیں۔ چوہدری غلام عباس نے لا کالج لاہور سے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس سے پہلے انھوں نے زمانہ طالب علمی میں ریاست میں ''ینگ منز مسلم ایسوسی ایشن'' کی بنیاد رکھی۔ ینگ منز کے اغراض و مقاصد نام سے ہی ظاہر تھے۔ یہ جماعت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بنائی گئی تھی۔ ینگ منز مسلم ایسوسی ایشن نے رفاہی، اصلاحی اور دینی پروگراموں کے ذریعے کشمیری مسلمانوں کے اصلاح احوال کی کوشش کی۔ نوجوانوں کی اس تنظیم نے آگے چل کر ریاستی مسلمانوں میں جذبۂ آزادی بیدار کرنے میں بے حد موثر کردار ادا کیا۔

شیخ عبداللہ 1930ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کر کے آئے تو صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں ان کی تعلیمی صلاحیت کے مطابق ملازمت نہ دی گئی جس کا ان پر شدید ردعمل ہوا۔

میر واعظ مولانا محمد یوسف نے دیوبند سے تعلیم حاصل کی تھی اور ان کا تعلق کشمیر کے ایک انتہائی بااثر خاندان سے تھا۔ میر واعظ مولانا محمد



یوسف کے برعکس شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کسی دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل نہ تھے لیکن چوہدری غلام عباس نے زمانہ طالب علمی میں جس تنظیم کی بنیاد رکھی اس تنظیم کے نام اور کام سے ان کی ذہنی وقلبی کیفیت وحالت ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کی بیداری ونجات کے لیے اسلام کا پلیٹ فارم ہی مؤثر ومناسب سمجھتے تھے۔ چوہدری غلام عباس کی ساری جدوجہد اسی نکتے کے گرد گھومتی ہے۔

ابتدا میں مقبوضہ جموں وکشمیر کے مسلمانوں کا احتجاج صرف ظالمانہ محاصل کے خلاف تھا لیکن وہ احتجاج جس نے باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کی وہ ریاستی حکام کی اسلامی عبادات پر پابندی و بندش کے خلاف تھا۔ اسلامی عبادات میں مداخلت کے یکے بعد دیگرے دو واقعات رونما ہوئے جن کے خلاف ریاست کے مسلمان سراپا احتجاج بن گئے اور یہی احتجاج بعد میں چلنے والی آزادی کی تحریک کا نکتہ آغاز بنا۔ پہلا واقعہ 29 اپریل 1931ء کا ہے جب جموں کے مسلمان نماز عید ادا کرنے کے لیے عیدگاہ میں جمع تھے۔ خطیب صاحب خطبے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان کر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بذات خود اپنے اندر آزادی اظہار وافکار کا سبق رکھتا ہے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ڈوگرا آئی جی جو وہاں ڈیوٹی پر تھا، نے خیال کیا کہ امام صاحب فرعون کی آڑ میں مہاراجہ ہری سنگھ کا ذکر کر رہے ہیں۔ آئی جی نے انسپکٹر کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر امام صاحب کو خطبہ عید دینے سے روک دے۔ یوں خطیب صاحب کو خطبہ دینے سے زبردستی روک دیا گیا۔ آئی جی کا یہ حکم دین میں کھلی مداخلت تھی جس سے جموں کے مسلمان سراپا احتجاج بن کر سڑکوں پر نکل آئے۔ اس احتجاجی جلوس کی قیادت چوہدری غلام عباس کی ینگ منز مسلم ایسوسی ایشن نے کی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ احتجاج پوری ریاست میں پھیل گیا۔ دوسرا واقعہ توہین قرآن کا ہے۔ 4 جون 1931ء کو ایک ہندو کانسٹیبل لبھو رام نے ایک مسلمان کانسٹیبل، جب وہ قرآن پڑھ رہا تھا، سے کہا: ''تم کیا بکواس پڑھ رہے ہو؟'' اور مسلمان کانسٹیبل سے قرآن چھین کر زمین پر پٹخ ڈالا۔ توہین قرآن کے اس واقعہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

چنانچہ ریاست کے مسلمان 4 جون کے توہینِ قرآن کے واقعہ کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے تو اس سلسلہ میں خانقاہ معلّٰی میں نماز جمعہ کے بعد احتجاجی جلسہ ہوا۔ میر واعظ مولانا محمد یوسف اور شیخ عبداللہ جمعہ کے اجتماع سے خطاب کر چکے تھے کہ ایک اجنبی نوجوان جس کا نام بعد میں عبدالقدیر بتایا گیا تھا اٹھا اور اس نے ولولہ انگیز انداز میں مسلمانوں کی غیرت ایمانی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا: ''مسلمانو! اٹھو اب وقت آ گیا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ یادداشتوں سے ظلم وستم کا سلسلہ ختم ہوگا نہ توہین قرآن کا مسئلہ حل ہوگا اور نہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو پاؤ گے۔ اٹھو! مہاراجہ کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔'' حکومت نے اس نوجوان کے خلاف مقدمہ درج کر لیا اور مسجد کے دروازے پر نوٹس چسپاں کر دیا کہ کوئی شخص ڈپٹی کمشنر کی اجازت کے بغیر مسجد میں جلسہ یا تقریر نہیں کر سکتا۔ حکومتوں کے جبر سے آزادی کی تحریکیں کبھی رکتی اور دبتی نہیں، خاص کر جب تحریکوں کو مذہبی سپورٹ بھی حاصل ہو۔ حکومت کی ظالمانہ پابندی کے خلاف لوگوں کا ردعمل فطری بات تھی۔ چنانچہ صرف 15 دن کے وقفے کے بعد 28 جولائی کو مسلمانوں نے مسجد میں دوبارہ جلسے کا اعلان کر دیا۔ اس جلسے میں ایک لاکھ فرزندان توحید نے شرکت کی اور حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی آزادی سلب کرنے اور مساجد پر پابندی کی مذمت کی گئی۔ یہ جلسہ ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ کا پہلا سیاسی جلسہ اور اجنبی نوجوان عبدالقدیر کے خلاف قائم ہونے والا مقدمہ پہلا سیاسی مقدمہ تھا۔ اس کے بعد 13 جولائی 1931ء کا ایمان افروز اور ولولہ انگیز واقعہ پیش آیا۔ 13 جولائی عبدالقدیر کے مقدمہ کی سماعت کا پہلا دن تھا۔ جیل کے باہر مسلمانوں کا جم غفیر جمع تھا جو اسلام زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔ اس اثنا میں نماز کا وقت ہو گیا۔ مسلمان نماز کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ایک نوجوان دیوار پر کھڑا اذان کہہ رہا تھا کہ ڈوگرا گورنر نے پولیس کو فائرنگ کا حکم دیا۔ گولی اذان کہنے والے نوجوان کو لگی، وہ شہید ہو گیا۔ اس کی جگہ دوسرا نوجوان دیوار پر چڑھا اور پہلے نوجوان نے اذان جہاں چھوڑی تھی وہاں سے شروع کر دی، اس طرح یکے بعد دیگرے 21 نوجوان اذان کی تکمیل کرتے شہید ہو گئے۔ (بقیہ صفحہ 50)

روس میں روشنی کے مینار

عبدالمالک مجاہد



کم وبیش بارہ سال پہلے، یعنی سن 2000ء کی بات ہے کہ جب ہم نے روسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ڈاکٹر محمد محسن خان صاحب کی وساطت سے ہمارا رابطہ سسٹر'' زلالہ'' نام کی ایک روسی مسلم خاتون سے ہوا ۔یہ خاتون ایک روسی ریاست ''جمہوریہ بشکورتستان'' (Republic of Bashkortostan) کی رہنے والی اور ''اوفا'' یونیورسٹی میں انگریزی زبان کی پروفیسر تھیں ۔''اوفا'' (Ufa) ''بشکورتستان'' کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔یہ وہاں کا صنعتی، تجارتی، سائنسی اور ثقافتی مرکز ہے۔سسٹر ''زلالہ'' کے دل میں بڑی شدت سے یہ ذوق و شوق پیدا ہوا کہ وہ قرآن کریم کا روسی زبان میں ترجمہ کریں۔ڈاکٹر محمد محسن خان صاحب نے ''نوبل قرآن'' کے نام سے جو ترجمہ کیا ہے وہ انھیں کہیں سے مل گیا اور اسے سامنے رکھ کر انھوں نے ترجمہ شروع کردیا۔روسی زبان میں قرآن کریم کے 30 سے زائد تراجم موجود ہیں مگر ان کے ذہن پر یہ دھن سوار تھی کہ وہ نہایت آسان، سادہ اور عام فہم انداز میں قرآن کریم کا ترجمہ کریں۔قرآن کریم کا کسی دوسری لغت میں ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔اس کے لیے بلاشبہ قرآن کریم کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔راقم الحروف کو قرآن کریم کے تراجم کروانے اور شائع کرنے کے حوالے سے کم وبیش 18 سال کا تجربہ ہے۔مجھے اس اہم کام کی نزاکتوں کا خوب اندازہ ہے۔یہ بہت ذمہ داری کا کام ہے۔سسٹر ''زلالہ'' کے ترجمہ شدہ چند پارے ہمارے پاس پہنچے تو میں نے انھیں مدینہ یونیورسٹی میں بھجوادیا۔وہ طلبہ جو یونیورسٹی میں آخری سالوں میں زیر تعلیم ہیں ان کی عربی خاصی اچھی ہوجاتی ہے۔مدینہ یونیورسٹی کا اپنا علمی ماحول ہے۔مسجد نبوی کی بے شمار برکات ہیں۔ اکثر طلبہ عصر کی نماز کے بعد مسجد نبوی میں چلے جاتے ہیں اور علمی مراجعہ کا کام کرتے ہیں۔اصحاب صفہ کا چبوترہ تو مسجد نبوی میں اب ختم ہوچکا ہے مگر درس وتدریس، قرآن کریم کی تعلیم کے حلقہ جات اب بھی باقی ہیں۔ہم نے چن کر ایسے طلبہ کا انتخاب کیا جو روسی نژاد تھے یا ان کی روسی زبان خاصی مضبوط تھی۔ان سے اس ترجمہ کا مراجعہ کروایا۔



انھوں نے چند ایک تبدیلیاں تجویز کیں۔ہم نے ان کی تصحیح کرکے اسے شائع کردیا۔اس دوران سسٹر'' زلالہ'' سے متعدد مرتبہ فون پر رابطہ ہوا۔میں نے اپنی زندگی میں اس جیسی مخلص اور ایثار پیشہ خواتین بہت کم دیکھی ہیں۔ان کا اعلیٰ جذبہ اخلاص، اسلام کے ساتھ ان کی شدید وابستگی اور قرآن کریم سے محبت یقیناً قابل رشک ہے ،اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔کفر والحاد کے اس ماحول میں پرورش پانے اور رہنے کے باوجود یہ خاتون اللہ سے اتنا پیار کرتی ہیں کہ دیکھ کر رشک آتا ہے۔میں نے کئی مرتبہ اپنے ایمان سے اس خاتون کے ایمان کا تقابل کرنے کی کوشش کی،تو ہر دفعہ اپنی اس روسی بہن ''زلالہ'' کو میں نے ایمان و ایقان کے نہایت اعلیٰ مقام و مرتبہ پر پایا۔میں نے انھیں متعدد بار پیشکش کی کہ ہم انھیں معاوضہ دینے کے لیے تیار ہیں مگر وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتیں: ''برادر!میں یہ کام صرف اللہ کی رضا کے لیے کررہی ہوں،مجھے اسی سے اجر و ثواب چاہیے۔'' میں ان کے ساتھ بحث کرتا: سسٹر! ہم آپ کے کام کا معاوضہ نہیں دے رہے،بس یہ معمولی سا ہدیہ ہے جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں..... آپ مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر ارسال کردیں۔

نہیں برادر! ہرگز نہیں!ہر دفعہ میرے اصرار کے بعد میری اس مسلم بہن کا یہی جواب ہوتا۔میں نے مختلف بہانے بنائے، مختلف اندازاختیار کیے کہ چلیے اپنے لیے نہ سہی، اپنے بچوں کے لیے ہی قبول کرلیجیے۔ میری طرف سے کوئی تحفہ لے کر بچوں کو دے دیجیے،مگر ہر مرتبہ ان کا ایک ہی جواب ہوتا: برادر! مجھے اس کا معاوضہ صرف اور صرف اپنے رب سے لینا ہے۔

میں فون بند کردیتا اور سوچتا رہتا کہ آج کے اس مادی دور میں روس میں رہنے والی اس خاتون کے ایمان کو ذرا دیکھیے۔اپنے رب کی کتاب سے اس کی محبت ملاحظہ فرمایئے کہ وہ اتنے سالوں کی محنت کا کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتی۔میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ اس قسم کے لوگ اب ناپید ہیں مگر یقیناً ایسے بے غرض اور مخلص افراد انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں،ورنہ اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہے کہ ان کا سب سے پہلا سوال ہی یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کا معاوضہ کیا ادا کریں گے۔

سسٹر''زلالہ'' کئی سال پہلے یونیورسٹی کی ملازمت سے ریٹائر ہوچکی ہیں۔ اب وہ ''اوفا'' سے کوئی دوسوکلومیٹر دور رہائش پذیر ہیں جہاں وہ اپنے سسر کی تیمارداری کررہی تھیں،تاہم گزشتہ دنوں ان کے سسر کا انتقال ہوگیا۔''زلالہ'' کا کوئی بیٹا نہیں ، ایک بیٹی ہے۔کئی سال پہلے ان کے داماد کا فون آیا تھا۔وہ کہہ رہے تھے: میں کویت میں ہوں اور میری ساس آپ کا پوچھتی رہتی ہیں۔''زلالہ'' کی بیٹی بھی نہایت پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ان کی معرفت اس خاتون کے بارے میں اطلاع ملتی رہتی تھی۔گزشتہ سال وہ حج کے لیے آئیں تو میں سعودی عرب سے باہر تھا،اس لیے ملاقات نہ ہوسکی۔

ان کی خواہش تھی کہ ہم ان کا کیا ہوا پورے قرآن کریم کا ترجمہ شائع کریں۔میں نے شرط لگادی کہ جب تک اس کا مراجعہ کوئی ایسا روسی عالم نہ کرلے جس کو عربی پر عبور ہو تب تک ہم پورا قرآن کریم شائع نہیں کرسکتے۔پھر ایک روز ایک روسی کا فون آگیا۔ وہ عربی زبان میں بات کررہا تھا : میرا نام عبدالغفار ہے۔میں بشکورتستان کے دارالحکومت اوفا سے بات کررہا ہوں۔ آج کل میں سسٹر''زلالہ'' کے ساتھ قرآن کے ترجمہ کا کام کررہا ہوں۔

عبدالغفار کا فون آئے ہوئے کئی روز گزر گئے اور میں دیگر مصروفیات میں رہا۔کل شام اپنے موبائل پر کوئی نمبر چیک کررہا تھا تو عبدالغفار کا نام سامنے آگیا۔غیر ارادی طور پر میری انگلی اس نمبر پر دب گئی۔عبدالغفار سے رابطہ ہوگیا۔کوئی پندرہ منٹ تک گفتگو ہوتی رہی،اس کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

میں آج کل دوبارہ قرآن کریم کے ترجمہ کو عربی زبان کے ساتھ ملا رہا ہوں،سسٹر زلالہ کا سسر وفات پاگیا ہے،مگر وہ اب بھی اوفا سے دوسوکلومیٹر دور ایک شہر میں مقیم ہے اور قرآن کریم پر کام کررہی ہے۔

میں نے حصن المسلم کا ترجمہ تاتاری زبان میں کیا ہے ، میری خواہش ہے کہ دارالسلام اسے شائع کرے۔

میں نے پوچھا! کیا آپ کو تاتاری زبان آتی ہے؟

کہنے لگے:ہاں میری مادری زبان تاتاری



ہی ہے،میری والدہ کا تعلق تاتارستان سے ہے۔سبحان اللہ! تاتاری زبان میں بھی اسلامی لٹریچر شائع ہوگا،ہم دعاؤں کا ترجمہ شائع کریں گے ؟میں جذباتی ہو گیا، ان شاء اللہ برادر عبدالغفار! میں یہ کتاب ضرور شائع کروں گا،تمھارے ساتھ وعدہ رہا.....

مگر مسلمانوں کے حالات کیسے ہیں اور پھر اس نے بشکورتستان کے حالات بتانا شروع کردیے،اس ملک کی آبادی کم وبیش 4 سے 5 ملین ہے،جن میں 60 فیصد مسلمان ہیں، میں ان دنوں بشکورتستان یونیورسٹی میں استاد ہوں۔

آپ عربی بہت اچھی بول رہے ہیں ۔یہ آپ نے کہاں سے سیکھی؟ میں نے سوال کیا۔

میں دراصل تاشقند میں پڑھاتا رہا ہوں۔ وہاں پر كلية اللغة العربية میں عربی زیادہ پڑھائی جاتی ہے۔میں نے وہاں سے عربی سیکھی ہے۔ ہماری اس یونیورسٹی میں 15 شعبے ہیں، یہاں ترکی،فارسی،چینی، روسی، انگریزی اور تاتاری زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔میں یہاں پر تاتاری اور روسی زبان پڑھاتا ہوں۔ ہمارے ملک کے صدر کا نام رستم حمیدو ہے۔یہ مسلمان ہے اور دو سال قبل ہی اقتدار میں آیا ہے۔اوفا میں مسلمانوں کے حالات عموماً بہتر ہیں۔

میں نے مساجد کا پوچھا تو کہنے لگا: ہمارے شہر میں بدقسمتی سے مساجد کی تعداد بہت کم ہے۔ میرے بار بار کے سوال کے جواب میں کہنے لگا: اوفا میں صرف 5 مساجد ہیں۔جمعہ کے روز مساجد بھر جاتی ہیں ،مگر عام دنوں میں خالی نظر آتی ہیں۔عبدالغفار کا اصرار تھا کہ میں اوفا کی سیر اور ان سے ملاقات کے لیے ضرور آؤں۔کہنے لگا: آج کل یہاں کا موسم بڑا شاندار ہے۔دن کے وقت درجہ حرارت 30 سینٹی گریڈ اور رات کے وقت 25 سینٹی گریڈ رہتا ہے۔

میں نے عبدالغفار سے سوال کیا: اگر میں اوفا کی سیر کے لیے آؤں تو میں نے تو داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ایئرپورٹ پر یا دوران سیر مجھے تنگ تو نہیں کیا جائے گا؟

کہنے لگا: نہیں آپ بڑے شوق اور اطمینان سے آئیں ۔یہ شہر بڑا تاریخی اور خوبصورت ہے۔بڑے بڑے باغات اور خوبصورت عمارتیں ہیں۔اس شہر کی خصوصیت چمڑے کی مصنوعات ہیں۔

میں نے سوال کیا: اگر تم محسوس نہ کرو تو یہ بتاؤ کہ تم نے داڑھی رکھی ہوئی ہے۔کہنے لگا: میری خواہش ہے مگر میں چونکہ سرکاری ملازم ہوں۔اوفا کی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں، اس لیے میں حکومت کے قانون کے تحت داڑھی نہیں رکھ سکتا،مگر آپ کو بازاروں اور گلیوں میں ایسے متعدد افراد ملیں گے جو باریش ہیں۔

قارئین کرام !روس کے مسلمانوں نے اسلام کے لیے بے حد قربانیاں دی ہیں ،جب ہم ان مظالم کی داستان پڑھتے ہیں جو کمیونسٹوں نے مسلمانوں پر انقلاب کے دوران کیے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بظاہر اگر دیکھا جائے تو اوفا جو بڑا تعلیمی اور صنعتی شہر ہے اور جس کے باشندوں میں 60 فیصد مسلمان ہیں ،وہاں صرف 5 مساجد ہیں تو بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے، مگر میرے سامنے ایک رپورٹ ہے۔ چلیے اسے پڑھتے ہیں اور پھر آگے بڑھتے ہیں۔

انقلاب روس سے پہلے 1912ء میں روس میں مسجدوں کی تعداد 26 ہزار 279 تھی،ان میں بخارا اور خوارزم کی مساجد شامل نہیں ۔اس وقت کے مسلمانوں کی تعداد کے حساب سے سات سو سے ایک ہزار مسلمانوں کے لیے ایک مسجد میسر تھی ،لیکن 1942ء میں ان مساجد کی تعداد صرف ایک ہزار تین سو بارہ رہ جاتی ہے، گویا 31 سالوں میں کم وبیش 25 ہزار مساجد کو شہید کردیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد حالات نے تھوڑا سا پلٹا کھایا۔روس کی حکومت مسلمانوں کو راضی کرنا چاہتی تھی، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو چار اسلامک سنٹر بنانے کی اجازت دے دی۔ ان میں سے ایک مرکز اوفا میں تھا، جسے روس کی مذہبی امور کی وزارت کی نگرانی میں چلایا جاتا تھا۔روس کی آبادی 145 ملین ہے جن میں مسلمانوں کی تعداد 25 ملین، یعنی ڈھائی کروڑ ہے۔

اوفا میں دو اسلامی مدارس ہیں جن میں قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے ۔2008ء میں مدرسہ مریم میں پورے بشکورتستان کی سطح پر مقابلہ حسن قراءت ہوا جس میں 2 سو سے زائد بچوں نے حصہ لیا۔یہ بچے ملک کی مختلف مساجد سے آئے تھے۔ان بچوں کو عمروں کے لحاظ سے مختلف گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ان میں سات سال سے کم عمر کے بچے اور زیادہ سے زیادہ سولہ سال کے بچے شامل تھے۔ان بچوں نے



مساجد میں قائم حلقات قرآن میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مقابلے میں پہلے انعام کے مستحق بچے کو ایک کمپیوٹر سیٹ دیا جانا تھا۔ ججوں کے فیصلے کے مطابق سب سے زیادہ خوبصورت تلاوت کرنے والے بچے کو یہ انعام دیا گیا۔ مقابلہ حسن قراءت کے بعد بچوں کو دریا کی سیر کروائی گئی۔ اس کے لیے ایک بڑی کشتی کا بندوبست کیا گیا تھا، بچے اس سیر سے خوب محظوظ ہوئے۔

قارئین کرام! روس میں مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے گئے ہیں تاریخ انسانی میں اس کی مثال بمشکل ہی ملتی ہے۔ ذیل کی سطور میں انھی مظالم میں سے ایک کا ذکر کرتے ہیں:

1940ء میں اوفا میں مسلمان زعماء کو کانفرنس کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کانفرنس میں شرکاء نے اس بات پر زور دیا کہ روسی حکومت کے ساتھ اس کے دشمن کے مقابلے میں تعاون کیا جائے گا۔ ان دنوں ملک میں خانہ جنگی جاری تھی۔ گویا اس کانفرنس میں روسی حکومت کو مسلمانوں نے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا، مگر جیسے ہی خانہ جنگی ختم ہوئی، حکومت قدرے مضبوط ہوئی اور اسے داخلی انتشار سے چھٹکارا ملا تو اس نے مسلمانوں پر خیانت اور غداری کے الزامات عائد کر دیے۔ بے شمار مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔ ہزاروں کو بغیر مقدمہ قائم کیے جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ وہاں پر نہایت وحشیانہ طریقے سے مظالم ڈھائے گئے۔ اسٹالن کے مرنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں نے اس واقعہ پر صرف ان الفاظ میں تبصرہ کیا: اسٹالن سے غلطی ہوگئی تھی۔

روسی حکومت میں جو بھی نیا سربراہ آتا وہ پہلی حکومت پر تنقید کرتا کہ انھوں نے مسلمانوں پر ظلم کیے تھے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے، مگر وہ خود عملاً اتنے ظلم کرتا کہ مسلمان سابقہ مظالم بھول جاتے۔ مسلمانوں پر مزید پابندیاں عائد کر دی جاتیں۔

قارئین کرام! اس مضمون کی تیاری کے دوران میں نے انٹرنیٹ پر تلاش کیا کہ اوفا میں کتنی مساجد ہیں، مگر صحیح معلومات نہ مل سکیں تاہم اس دوران مجھے ایک مختصر سی ڈاکومنٹری مل گئی، جس میں اوفا کی رہنے والی ایک خاتون منیرہ کا گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ اس حادثے میں منیرہ بری طرح زخمی ہوجاتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہے کہ اللہ اسے صحت دے اور وہ وعدہ کرتی ہے کہ اگر اسے شفاء مل گئی تو وہ اپنی جیب خاص سے مسجد تعمیر کرائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول کی اور اسے مکمل شفاء عطا فرمائی۔ اس نے فوراً اپنے وعدے کے مطابق حکومت کو درخواست دیدی کہ اسے مسجد تعمیر کرانے کی اجازت دی جائے جسے حکومت نے منظور کر لیا۔ عمارت کی تعمیر شروع ہوئی تو کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شیطان کا گھر بن رہا ہے۔ یہاں پر ناچ گانا اور ڈانس ہوا کرے گا، مگر جب انھوں نے مسجد کے مینار کو بلند ہوتے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اس مسجد کے افتتاح پر مفتی بشکورتستان کا مختصر سا انٹرویو بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے کہا: کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ اس جمہوریہ میں مساجد کی تعداد صرف 16 تھی جبکہ اب ان کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ مسجد بڑی خوبصورت اور دلکش ہے، اگلی صفوں میں مرد نمازی اور نہایت پچھلی صفوں میں خواتین نمازی نظر آرہی ہیں۔ اس مسجد کو بنانے والی خاتون منیرہ نے صرف مسجد ہی نہیں بنائی بلکہ مسلم خواتین کی تنظیم بھی بنائی ہے جو عورتوں میں دعوت کا کام کرتی ہے۔ مختلف دینی محفلوں کا اہتمام کرتی ہے اور بچیوں کو عربی زبان اور قرآن کریم کی تعلیم دیتی ہے۔

اوفا میں ایک ''مسجد احسان'' ہے جس کی تصاویر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کتنی محنت اور عقیدت سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ظلم وتشدد، پابندیاں اور مشکلات اپنی جگہ، مگر اہل توحید ہر دور میں اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اپنے خون سے اس دعوت کی آبیاری کرتے رہے، جیلوں میں گئے، ان کے بچوں کو قتل کر دیا گیا، ان کے مکانات، مدارس اور مساجد تک مسمار کر دی گئیں، مگر جیسے ہی حالات سازگار ہوئے انھوں نے پھر سے اللہ کے گھروں کی تعمیر کا بیڑا اٹھالیا اور انھیں آباد کرنا شروع کر دیا۔ جب تک سسٹر ''زلالہ''، سسٹر ''منیرہ'' اور عبدالغفار جیسی عظیم شخصیات ان روسی ریاستوں میں موجود رہیں گی، روشنی کے یہ چراغ جلتے رہیں گے۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلا آرہا ہے، وہ اپنی آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دے کر جارہے ہیں کہ ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں..... لاالہ الااللہ



امریکہ آکر کایا پلٹ گئی

حافظ عبدالوحید سوہدروی

بسم اللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ، اما بعد!

امریکہ کی طرف آج کل پوری دنیا کا رجحان ہے۔ لوگوں کا یہ رجحان ہر زمانے میں کسی نہ کسی ملک کی طرف رہتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ رجحان متحدہ اسلامی مملکت کی طرف بھی رہا ہے جب لوگ دمشق و بغداد جانے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿وَ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ﴾ ''ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے اور بدلتے رہتے ہیں۔''

(آل عمران 140:3)

اس رجحان کی سب سے اہم وجہ تو معاشی ہوتی ہے پھر دنیاوی علم کا حصول بھی، تو چونکہ آج کل امریکہ معاشی ترقی میں صفِ اول پر ہے اور علوم وفنون میں ترقی بھی اس کے حصے میں آئی ہے، لہٰذا اس کی طرف عوام کا رجحان ایک قدرتی بات ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کو قوموں کے عروج و زوال کی یہ داستان بڑی واضح نظر آئے گی جو کئی کئی صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔ زوالِ امریکہ کے متمنی حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک پر تو ابھی صرف تین صدیاں ہی گزری ہیں، یعنی اللہ پاک کے حساب سے نصف دن سے بھی کم۔ کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ ''بلاشبہ تیرے رب کے نزدیک ایک دن تمھاری گنتی کے ایک ہزار سال کی مانند ہے۔'' (الحج 47:22) لہٰذا ابھی آپ کو صبر کرنا پڑے گا۔ ہاں جب ظلم کی انتہا ہو جائے تو قوموں کے عروج کی مدت کم بھی کر دی جاتی ہے۔

امریکہ آنے کے لیے منجملہ دیگر پُرکشش عوامل کے ایک اور چیز جو بیمار دلوں کو بھاتی ہے وہ بے حیائی میں آزادی ہے۔ کہنے کو تو یہ آزادی ہے مگر یہ آزادی بھی قانون کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس حد تک کہ اس کی زد میں آنے سے امریکہ کے چند صدر بھی نہ بچ سکے اور انھیں صدارت جیسے عظیم عہدہ کو خیر باد کہنا پڑا۔ صدر کلنٹن کی مثال ہمارے سامنے ہے جو معاشقہ کی وجہ سے صدارت کی دوسری میعاد کے لیے کھڑے نہ ہو سکے اور یوں ان کی مخالف پارٹی کے مسٹر بش میدان مار کر صدر بن گئے۔ امریکہ میں نئے آنے والے لوگ تھوڑے ہی عرصہ میں اس آزادی کی حقیقت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک شیطانی جال ہے جس میں پھنس کر بھی لوگوں کو عقل نہیں آتی۔ یہاں دفاتر میں کام کرنے والی کئی خواتین اپنے باس، یعنی آفیسرز پر ورغلانے کا الزام لگا کر ہزاروں نہیں، لاکھوں ڈالر بذریعہ عدالت وصول کر چکی ہیں۔ اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جو خواتین کے لیے بڑا نفع بخش ہے۔

اللہ پاک کے انوکھے انداز

اللہ تعالیٰ اپنی صفات بابرکات میں یکتا ہے جس کے تخلیقی انداز بھی نرالے ہیں۔ وہ خیر



سے شر اور شر سے خیر پیدا کر کے اپنی قدرت کے انوکھے انداز سے لوگوں کو حیران کرتا رہتا ہے۔ امریکہ کو اگر گناہوں کا سمندر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سمندر میں نہ جانے کتنے مسلمان اپنے ایمان کی دولت غرق کر چکے ہیں۔ مگر جس طرح سمندر میں غرق ہونے والوں میں سے کوئی بچ بھی جاتا ہے اسی طرح گناہوں کے اس سمندر میں غرق ہونے سے اللہ تعالیٰ کئی ایک کو بچا لیتا ہے۔ مگر بچتا وہ ہے جو بچنے کی کوشش کرے۔ سمندر میں جس طرح جزیرے ہوتے ہیں اسی طرح امریکہ کی سرزمین میں اللہ کی مسجدیں جزیروں کی مانند ہیں۔ اور یہ جزیرے اللہ کے فضل سے دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ ستمبر 2001ء کے بعد اگرچہ مساجد کو آگ لگانے کے اکا دکا واقعات سامنے آتے رہتے ہیں مگر بفضلِ خدا ہمیں ان کی تعداد میں کوئی کمی ہوتے دکھائی نہیں دیتی۔ روحانی جان بچانے کے لیے مساجد کی اہمیت خشکی کے جزیروں سے کم نہیں۔ کاش! یہاں بسنے والے سارے مسلمان اس حقیقت سے آشنا ہو جائیں۔

پستی کی انتہا

امریکہ میں رہتے ہوئے اگر اپنے دین سے دوری ہو تو نوبت یہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے کہ ایک شادی شدہ خوبرو پاکستانی نوجوان، جس کی پرورش والدین کے ہمراہ لیبیا میں ہوئی تھی، ہماری مسجد میں چند روز تک آنے کے بعد غائب ہو گیا۔ میں ایک نمازی کے ہمراہ اس کے گھر خبر لینے گیا تو وہ بچوں کی بے بی سٹنگ، یعنی نگہداشت کر رہا تھا کیونکہ بیگم خریداری کرنے گئی ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب اس کی بیگم کسی غیر شخص کے ہمراہ گھر واپس لوٹی تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سوچا کہ اگر یہ صورتِ حال ایک مسلمان گھرانے کی ہو جائے تو پھر رحمتِ خداوندی کا نزول کیسے ہو۔ ایک مسلمان گھرانے کی اس سے زیادہ پستی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ان صاحب کی پہلی شادی بھی ایک امریکن خاتون سے ہوئی تھی جو بوجہ ناچاقی طلاق لے کر بچوں سمیت الگ ہو گئی اور بذریعہ عدالت خاوند کی تنخواہ سے بچوں کے نام کا ماہانہ خرچ وصول کر کے موج اڑا رہی ہے۔ ان صاحب کو تب بھی عقل نہ آئی کہ اب دوسری شادی کسی دیسی یا مسلمان خاتون سے کر لیں۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: «لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ» ”مومن ایک سوراخ سے دوبار ڈنگ نہیں کھاتا۔“ (صحيح البخاري: 6133) ذرا غور کیجیے اور صدقے جایئے اپنے نبی کے جس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ معنی خیز ہوتا ہے اور کئی گتھیاں سلجھا دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے اس حدیث میں مسلمانوں کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ مومن فرمایا ہے۔ تو گویا جو مومن ہوگا وہ سنبھل جائے گا اور دوبارہ ڈنگ نہیں کھائے گا۔ اس کے برعکس جو صرف مسلمان ہوگا وہ دوبارہ سہ بارہ ڈنگ کھاتا جائے گا۔ قارئین کرام مسلم اور مومن کا فرق مختصراً اس طرح سمجھیں کہ قانونی طور پر تو ہر کلمہ گو مسلمان کہلاتا ہے مگر آدمی مومن تب بنتا ہے جب کلمہ دل کے اندر اتر کر بندے کو نیکی کا کام دل و جان سے کرنے پر ابھارے اور برے کاموں سے نفرت پیدا کر دے جس میں اللہ پاک سے محبت اور اس کے خوف کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے مسلمان تو آپ کو دنیا میں ڈیڑھ ارب سے اوپر مل جائیں گے مگر ان میں مومن کتنے ہیں یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن ہیں یقیناً وہ بہت تھوڑے۔ اللہ پاک ہمیں بھی ان میں شامل کر لے، آمین۔

بچوں کی فکر

یہاں پر اکثر مسلمانوں کی اپنی زندگی چاہے کیسی گزرتی ہے لیکن بچوں کا فکر انھیں ضرور دامن گیر ہوتا ہے جن کو وہ کم از کم ہفتہ یا اتوار کے روز چند گھنٹوں کے لیے اسلامک اسکول میں لاتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ کئی عاقبت نا اندیش والدین کو تو اس کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ ان کے بچوں کا اسلامی مستقبل انتہائی تاریک ہوتا ہے۔ اپنے بچوں کو اسلامک اسکول لانے والوں میں بعض ایسے بے عمل والدین بھی ہوتے ہیں جو ظہر کی نماز کے دوران مسجد سے باہر اپنی کار میں بیٹھے بچوں کی چھٹی کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ انھیں خود مسجد کے اندر آ کر نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ ایسے والدین گھر میں بچوں کی کیا اسلامی تربیت کرتے ہوں گے۔

میں جب نیا نیا امریکہ آیا تو مغرب کی نماز کے وقت بچوں کی قرآن کلاس کے خاتمہ پر ایک پاکستانی والد کو مسجد کے باہر ایک قیمتی کار میں بیٹھے بچوں کا انتظار کرتے دیکھتا تو مجھے ان



کے نماز میں شامل نہ ہونے پر بہت تعجب ہوتا۔ ایک روز نماز کے بعد میں ملنے گیا تو دیکھا نِکر پہنے بیٹھے ہیں کیونکہ کلب سے تشریف لا رہے تھے۔ گویا نِکر کی وجہ سے انھیں نماز سے محروم ہونا پڑتا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے وفات سے قبل نیک ہو گئے تھے۔ امارت کے بعد کئی سال تک غربت دیکھ کر وفات پائی۔ امریکہ میں جو والدین اپنے بچوں کی اسلامی تربیت سے بالکل غافل رہتے ہیں ان کی آئندہ نسلوں کو تو چھوڑیے صرف دوسری نسل کا اسلام کے حوالے سے جو حشر ہو سکتا ہے اسے سمجھنے کے لیے دور نہ جایئے امریکہ کے موجودہ صدر بارک حسین اوباما کی مثال سامنے رکھ لیجیے۔ جن کی دادی مسلمان ہے اور ابھی بھی سر پر سکارف لیتی ہے۔ مگر ان کے والد نے اسلام کو اہمیت نہ دے کر ان کی تربیت سے لاپروائی برتی اور بیٹے کو اپنی عیسائی بیوی کے سپرد کر دیا۔ تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اب وہ مسلم دنیا کے نہیں بلکہ عیسائی دنیا کے لیڈر بن گئے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی دوسری تیسری نسل کا نام نہاد مسلمان امریکہ میں صدارت جیسے اتنے بڑے عہدے پر پہنچ بھی جائے تو اس سے اسلام کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے، نقصان آپ جتنا چاہیں کرالیں، اس لیے کہ انھوں نے ہم وطنوں کے سامنے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرنا ہوتا ہے۔

اسلامک اسکولوں کی حالت

امریکہ میں ہفتہ وار اسلامک اسکول جیسے ہونے چاہییں ویسے نہیں ہیں۔ تاہم موجودہ اسکولوں کو بھی ہم غنیمت سمجھتے ہیں۔ ابتدائی دنوں میں ان کی تعلیم کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

مرحوم صدر ضیاء الحق کے ایک مشیر ڈاکٹر عبدالرحیم بزدار ہمارے شہر میں مقیم تھے۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران مختلف اسلامک اسکولوں کے بچوں کو تربیتی کورس کرایا کرتے تھے۔ ایک روز بچوں کی عدمِ تربیت کا رونا روتے ہوئے بڑی افسردہ طبیعت کے ساتھ مجھے بتانے لگے کہ بھری کلاس میں مجھے ایک مسجد کے ڈائریکٹر کے بیٹے نے سوال کیا کہ لڑکے کو کس عمر میں ڈیٹنگ (DATING) کرنی چاہیے۔ (اس کا مفہوم ہے صنفِ مخالف سے دوستی کے نام پر جنسی تعلقات قائم کرنا جو امریکی کلچر کی خصوصیت ہے۔ جن بچوں کا بلوغت کے بعد کوئی دوست نہ ہو تو ان کے لیے والدین کو ڈاکٹر سے چیک اپ کرانے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔) بزدار صاحب نے استغفار پڑھتے ہوئے کہا: یہ سوال ایک مسجد کے ڈائریکٹر کے بیٹے سے سن کر میں تو حیران رہ گیا کہ نہ ہی اسے گھر میں اور نہ ہی اسلامک اسکول میں بتایا گیا کہ یہ فعل اسلام میں قطعاً حرام ہے۔ اب آپ اندازہ لگا لیجیے کہ اگر یہ حال دیندار گھرانوں کے بچوں کا ہے تو پھر عام لوگوں کے بچوں کا کیا حال ہو گا۔ اسی طرح کے ایک واقعہ کا مجھے بھی تجربہ ہوا تھا۔ جب کلاس میں ایک دینی گھرانے کے سمجھدار طالب علم نے بڑی حیرت سے مجھے پوچھا کہ ''کیا سود اسلام میں حرام ہے؟ میں تو پہلی بار آپ سے یہ سن رہا ہوں۔ تو پھر بینک کیسے چل سکتے ہیں؟'' گویا اس کے بغیر تو ملک کا معاشی نظام ہی نہیں چل سکتا۔ اب یہی طالب علم وکیل بننے کے بعد ماشاء اللہ چہرے پر لمبی داڑھی سجائے پانچ وقت کا نمازی بن چکا ہے۔ گویا اللہ نے کایا پلٹ دی۔ اسی طرح ہم نے دیکھا کہ بغرضِ تعلیم امریکہ آنے والے کئی طالب علموں کی کایا پلٹ گئی۔ درحقیقت اپنے ملکوں کے دیندار لوگوں کو امریکہ آ کر بے دین ہوتے ہوئے دیکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ انسان دوسرے ماحول میں بہت جلد رنگا جاتا ہے، الا ماشاء اللہ۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ جب کوئی اپنے ملک کا پاپی امریکہ آ کر متقی بن جائے۔ کئی لوگ اپنے ملکوں میں اسلام سے دور ہوتے ہیں مگر یہاں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے خیر کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے سچ فرمایا ہے: «مَن يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْراً يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْن» ''جس کے ساتھ اللہ پاک خیر کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔'' (صحيح البخاري:7312)

چند سال پہلے کی بات ہے کہ دوسرے شہر سے ایک طالب علم دارالسلام کی کتب بڑے شوق سے منگوایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ہوسٹن ہمارے بک سٹور پر آیا تو چہرے پر ماشاء اللہ فیشنی نہیں بلکہ صحیح داڑھی کی رونق پا کر حیرانی ہوئی۔ ساتھ آنے والے اس کے کزن نے بتایا کہ یہ بنگلہ دیش کے اٹارنی جنرل کا بیٹا ہے۔ اپنے ملک میں اس کی جو حالت تھی کچھ نہ پوچھیے۔ مگر اب امریکہ آ کر جو اس میں



انقلابی تبدیلی آ گئی ہے اس پر اس کے سارے دوست اور رشتہ دار حیران ہیں کہ یہ ماجرا کیا ہے کہ امریکہ جیسے ملک میں جا کر اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اسی طرح بنگلہ دیش کے ایک آرمی جنرل کے دو بیٹے باقاعدہ نمازی بن گئے۔ یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے رنگ جو شر سے خیر اور خیر سے شر پیدا کرتے رہتے ہیں۔ دیندار گھرانوں کے افراد امریکہ آ کر جب بالکل بگڑ جاتے ہیں تو عام لوگوں کے بگڑنے کا تو شکوہ ہی نہیں۔

اس قسم کے انوکھے واقعات ہمیں قرآن نے بھی بتائے ہیں۔ وہی ہے قدرت والا جس نے فرعون کی اپنی بیوی آسیہ کو مسلمان کر دیا جبکہ فرعون اپنی مملکت میں اسلامی دعوت کو بزور شمشیر روک رہا تھا۔ دوسری طرف نوح اور لوط ﷺ کی اپنی بیویاں مسلمان نہ ہو سکیں۔ ہمارے زمانے کی مثال دیکھیے۔ کسے معلوم تھا کہ برطانیہ کے سابق وزیراعظم ٹونی بلیئر جو دنیا میں اسلام کا راستہ روکنے کے لیے امریکی صدر بش کے دستِ بازو بنے ہوئے تھے ان کی اپنی سالی اسلام قبول کر بیٹھے گی۔ جو تین ماہ قبل ہمارے شہر میں آ کر سر پر سکارف لیے مختلف تقاریب میں خطاب کر چکی ہیں۔

لہٰذا اللہ کی قدرت پر یقین رکھتے ہوئے اس قسم کی محیر العقول نشانیاں دیکھتے جایئے اور نتائج اسی کے حوالے کرتے ہوئے خلوص نیت سے دین کا کام اپنے گھر اور باہر کرتے رہیے۔ اللہ پاک ہم سب کو بچوں سمیت راہِ راست پر رکھے، آمین۔

بقیہ: مسئلہ کشمیر

یہ تھی تحریک آزادی کشمیر کی ابتدا۔ یہ تحریک سرینگر کی جامع مسجد اور خانقاہ معلّٰی میں پھلی پھولی، قرآن و اسلام کے سائے اور اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں پروان چڑھی۔ شیخ عبداللہ اپنی کتاب ''آتش چنار'' میں اس تحریک کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں: ''ہر جمعہ کو جامع مسجد میں میر واعظ کے خطاب کے بعد اجتماع ہوتا جو جلسے کی صورت اختیار کر لیتا۔ جس میں تلاوت قرآن مجید اور نعت خوانی کے بعد تقریریں ہوتیں۔ میری تلاوت ان جلسوں میں خاص طور پر پسند کی جاتی اور کلام پاک کی تاثیر سے مجمع پر رقت طاری ہو جاتی۔''

1932ء میں مسلمانوں نے کشمیر کی پہلی قومی اور سیاسی جماعت قائم کی جس کا نام آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس رکھا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کا وہ پہلا اجلاس جس میں اساسی دستور متفقہ طور پر منظور ہوا یہ اجلاس بھی مسجد میں ہوا تھا۔ چوہدری غلام عباس اپنی کتاب ''کشمکش'' کے صفحہ 943 پر لکھتے ہیں: تحریک حریت کشمیر خالصتاً اسلامی تحریک تھی۔ مسلمانوں کی اس تحریک کا نعرہ بھی خالص اسلامی تھا اور ہم نے دنیا کے سامنے اس تحریک کو اسلام کے نام اور وسیلے سے پیش کیا۔'' بقول پروفیسر الیف الدین ترابی: ''یہ تحریک دراصل ریاست کے اسلامی عہد کی بحالی کی تحریک تھی اور اس کا مقصد اسے غیر اسلامی تسلط سے نکال کر دوبارہ عالم اسلام کا حصہ بنانا تھا۔ اس اعتبار سے اس تحریک کو پاکستان کا ہراول دستہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔''

تحریک آزادی کشمیر کے راہنما سردار مختار خان ایڈووکیٹ جو کشمیر کی چلتی پھرتی تاریخ تھے اپنی کتاب ''آزادی کا خواب پریشان'' کے صفحہ 69 پر لکھتے ہیں: ''قیام پاکستان کے بعد جب مجاہدین نے ڈوگرا حکمرانوں کے پنجہ استبداد سے آزادی کے لیے مسلح جدوجہد شروع کی تو ہمیں پولیس نے گرفتار کر کے ڈوگرا فوج کے حوالے کر دیا، ہمیں 10 فٹ کے دو کمروں میں ٹھونس دیا گیا جس میں کل 62 افراد تھے اور صرف ایک روشن دان تھا۔ کمروں میں لیٹنا تو کجا کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ تھی۔ ہمارے ساتھ قید ایک مجاہد مولوی سید خان پر ہر وقت شہادت کا نشہ چھایا رہتا۔ وہ ہر وقت دبنگ اور سریلی آواز میں نعتیں اور جہادی ترانے پڑھتے رہتے۔ یہی ترانے مولوی صاحب کے لیے قہر کا پیغام بن گئے۔ فوجی مولوی سید خان پر شدید قسم کا تشدد کرنے لگے اور انھیں جہادی ترانے پڑھنے سے منع کیا جاتا لیکن انھوں نے ترانے پڑھنے کے ساتھ اذان کہنا بھی شروع کر دی۔ فوجی اس جرم کی پاداش میں انھیں زنجیروں میں جکڑ کر طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور مار مار کر ادھ موا کر دیتے لیکن جونہی انھیں ہمارے کمرے میں پھینکا جاتا وہ پھر نعتیں و ترانے پڑھنے لگتے یا اذان کا وقت ہوتا تو اذان کہنے لگتے۔ آخر ہندو فوج کے کمانڈنگ افسر نے سرکاری حکم نامے کے ذریعے اذان کی ممانعت کر دی اور اس کے لیے سزائے موت مقرر کر دی۔ سزائے موت کا حکم سنائے جانے کے باوجود سید خان کی اذان پھر گونجنے لگی جس پر سپاہیوں



نے ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اذان بند کرو، اذان بند کرو۔ مولوی سید خان نے اذان پوری کر کے سلاخوں کے اندر سے ہندو سپاہیوں کو سینہ تان کر کہا: جس زبان پر اللہ کا نام ہو وہ رک نہیں سکتی، اگر روکنا چاہتے ہو تو آؤ گولی مارو۔ ڈوگرا آفیسر نے مولوی سید خان کو عجیب وغریب سزا دی۔ اس نے کہا: ''چونکہ یہ آدمی خود موت کو بلا رہا ہے، لہٰذا اسے موت سے محروم رکھا جائے۔''

ایک وہ وقت تھا جب 13 جولائی 1931ء کو 21 کشمیری نوجوان اذان کہتے کہتے اسلام کی حرمت پر قربان ہوگئے تھے۔ تاریخ کا مسافر 13 جولائی 1931ء سے سفر کرتے کرتے اگست 1947ء پر آ کر رکتا ہے تو وہ کشمیری قوم کے جذبہ ایمانی کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط پاتا ہے۔ یہی جذبہ ایمانی کشمیری قوم کی پاکستان کے ساتھ الحاق کی وجہ اور بنیاد بنا۔

اس ضمن میں کشمیر کی تاریخ ہزاروں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اہل کشمیر الحاقِ پاکستان کے خواہاں تھے۔ کشمیری قوم کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا سب سے بڑا ثبوت اسلام کا وہ آفاقی نظریہ ہے جو تحریک آزادی کشمیر کی پہچان اور بنیاد بنا۔ اس نظریے نے بنگال، سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب کے لوگوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ ایسے مضبوط اور آفاقی نظریہ کی موجودگی میں کیسے ممکن تھا کہ پاکستان اور کشمیر جن کی سرحدیں، دریا اور جغرافیہ وغیرہ سب آپس میں ملتے تھے ایک نہ ہوتے۔

23 مارچ 1940ء کو لاہور میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس نے قیام پاکستان کے خدوخال واضح کر دیے اور راہ متعین کر دی تھی۔ اس اجلاس میں ریاست جموں وکشمیر کے مسلمان اور کشمیری قائدین بھی اسی جوش وجذبہ سے شریک ہوئے جس جوش و جذبہ سے برصغیر کے دیگر مسلمان شریک ہوئے تھے۔ کشمیری قائدین میں سے جن راہنماؤں نے اس اجلاس میں شرکت کی ان میں سردار فتح محمد خان کریلوی، پروفیسر ایم اے عزیز، ایم اے حفیظ، محمد اسماعیل ساغر، پیر ضیاء الدین اندرابی، پروفیسر محمد اسحاق قریشی، سید حسن شاہ گردیزی، منشی گل احمد خان اور مولوی غلام حیدر جنڈالوی شامل تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے دوران اسی پنڈال میں آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں متذکرہ بالا تمام کشمیری راہنماؤں نے شرکت کی اور مولوی غلام حیدر جنڈالوی نے تقریر بھی کی تھی، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری قوم برصغیر میں سیاسی بیداری کی مہم شروع ہونے کے ساتھ ہی اپنا مقدر مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ کر چکی تھی۔ شیخ عبداللہ نے جب مسلم کانفرنس میں نیشنل کانفرنس کے نام پر نقب لگائی تو اس کے بعد ایک عرصہ تک مسلم کانفرنس غیر فعال رہی۔ 23 مارچ 1940ء کے مسلم لیگ کے اجلاس نے کشمیری رہنماؤں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا، چنانچہ از سرنو مسلم کانفرنس کے احیاء کا فیصلہ ہوا۔ اس سلسلے میں مسلم کانفرنس کا پہلا سالانہ اجلاس 17 تا 19 اپریل کو مولانا ظفر علی خان کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں چوہدری غلام عباس کو مسلم کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ چوہدری غلام عباس کی قیادت میں جب آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس نے اپنی تنظیم نو کی تو پاکستان کو اپنی امیدوں کا مرکز اور اپنا مطمح نظر قرار دیا۔ تحریک آزادی کشمیر اور تحریک پاکستان کی بنیاد ایک تھی۔ دونوں اسلام کے مصفّٰی چشمہ سے سیراب اور قرآن کے نور سے فیض یاب ہوئیں، تحریک پاکستان اور تحریک آزادی کشمیر ایک ہی چشمہ سے بہنے والی دو ندیاں تھیں جو قیام پاکستان کے وقت باہم مل گئیں۔ 19 جولائی 1947ء کو سرینگر میں سردار محمد ابراہیم خان کے گھر میں مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل میں منظور ہونے والی قرار داد تحریک آزادی کشمیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ قرار داد تاریخ میں ''الحاق پاکستان کی قرارداد'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرار داد میں کہا گیا تھا:

''جغرافیائی، اقتصادی، لسانی، ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق بہت ضروری ہے کیونکہ ریاست کی آبادی کا 80 فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور پاکستان کے تمام بڑے دریاؤں، جن کی گزرگاہ پنجاب ہے، کے سرچشمے کشمیر میں ہیں۔ ریاست کی سرحدیں تو پاکستان کی سرحدوں سے پہلے ہی ملحق ہیں جہاں تک اہلیان ریاست کا تعلق ہے وہ بھی پاکستان کے ساتھ مذہبی، ثقافتی اور اقتصادی رشتوں میں مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کا الحاق پاکستان سے کیا جائے۔''

قرار داد منظور ہونے کے بعد سردار محمد ابراہیم نے ایک حلف نامہ لکھا جس پر سب شرکاء نے دستخط کیے۔ حلف نامے میں اس



عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ اگر مہاراجہ نے 15 اگست تک پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان نہ کیا تو سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جائے گی۔ کشمیری قوم کے راہنماؤں نے حلف میں الحاق پاکستان کے لیے جس سول نافرمانی کے عزم کا اظہار کیا تھا وقت آنے پر انھوں نے اس سے کہیں بڑھ کر قربانیاں دیں۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو الحاق پاکستان کے لیے کشمیری قوم کی قربانیاں اہل پاکستان سے بڑھ کر ہیں۔ اس سلسلے میں سردار مختار خان ایڈووکیٹ کی کتاب ''آزادی کا خواب پریشان'' کا صفحہ 144 کا یہ پیراگراف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے: ''پاکستان کو معرض وجود میں آئے ابھی 24 گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایمانی و جہادی جذبہ سے سرشار ہزاروں فرزندان توحید اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے جتھوں کی صورت میں نعرہ ہائے تکبیر، پاکستان زندہ باد اور کشمیر بنے گا پاکستان کے فلک شگاف نعرے لگاتے اور دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے راولاکوٹ کے کھلے میدان میں جمع ہونے لگے۔ نماز جمعہ سے پہلے اور نماز جمعہ کے بعد اہل کشمیر نے عہد کیا کہ ریاست جموں وکشمیر کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔''

یہی حال ریاست جموں وکشمیر کے دوسرے علاقوں کا تھا۔ کشمیر کا ہر پیر و جواں الحاق پاکستان کا خواہاں تھا۔ اہل کشمیر نے اپنے وطن میں اسلام کے احیاء وغلبہ اور الحاق پاکستان کا جو سفر اس وقت شروع کیا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔ حالات کی وجہ سے اس میں مدوجزر ضرور آئے ہیں لیکن یہ سفر رکا اور تھما نہیں، آزادی کی حالیہ تحریک کی پہچان، شناخت، نصب العین اور راہ عمل اسلام، قرآن اور الحاق پاکستان ہے۔

اسلام اور الحاق پاکستان کے نصب العین نے کشمیری قوم کو متحرک و فعال اور بے چین و مضطرب کر رکھا ہے۔ یہ اضطراب اور بے چینی ہی مسئلہ کشمیر ہے۔ اس اضطراب کی گونج کشمیر کے در و دیوار اور فلک بوس پہاڑوں میں صاف سنائی دے رہی ہے۔

اہل کشمیر نے 1947ء کے موقع پر قیام پاکستان کے لیے تاریخ ساز قربانیاں دے کر اپنا فرض پورا کر دیا بلکہ ان کی قربانیوں کا سفر اب بھی جاری ہے۔ 1947ء سے اب تک پانچ لاکھ کشمیری مسلمان اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر چکے ہیں، اس کے باوجود وہ تھکے اور ہارے نہیں۔ ان کے حوصلے مائل بہ پرواز اور ولولے مصائب سے بے نیاز ہیں مگر بدقسمتی سے پاکستان کے حکمران ان کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہے ہیں۔ کارگل کے ہیرو پرویز مشرف نے جس طرح اہل کشمیر کی پشت میں چھرا گھونپا، بھارت کو LOC پر باڑ لگانے کا موقع دیا اور مجاہدین کو دہشت گرد قرار دیا اس سے تحریک آزادی کشمیر کو بے پناہ نقصان پہنچا ہے۔ آصف علی زرداری نے اقتدار سنبھالتے ہی مجاہدین کی بندوقوں کو زنگ لگنے کی بددعا دی تھی۔ الغرض پاکستانی حکمرانوں کی تحریک آزادی کشمیر سے بے وفائی کی ایک طویل اور شرمناک داستان ہے۔

جہاں تک پاکستانی قوم کی طرف سے ہر سال 5 فروری کے دن اظہار یکجہتی کشمیر منانے کا تعلق ہے۔ یہ درست ہے کہ اس عمل سے کشمیری قوم کے حوصلے بڑھتے ہیں لیکن سال میں صرف ایک دن منا لینا کافی نہیں۔ 5 فروری کا دن عمل کا متقاضی ہے۔ پاکستانی قوم 20 سال سے 5 فروری کا دن منا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ بھارتی حکمرانوں کی صحت پر اس سے کیا اثر پڑ رہا ہے۔ بھارت ٹس سے مس نہیں ہو رہا بلکہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ کشمیر میں اپنا قبضہ مضبوط کر رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ ہمارے حکمرانوں کے قول اور فعل میں مطابقت اور موافقت نہیں۔ مسئلہ کشمیر پر پیش کی جانے والی قرار دادوں کو اگر اکٹھا کر کے دریائے نیلم اور دریائے جہلم میں ڈالا جائے تو یقیناً ان کا پانی سیاہ ہو جائے لیکن یہ قرار دادیں بے اثر ہیں، اس لیے کہ ان کے پیچھے قوت، طاقت اور عمل کا فقدان ہے۔ پس 5 فروری کا سبق یہی ہے کہ اگر ہماری قوم اور ہمارے حکمران مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے سنجیدہ و مخلص ہیں تو اس کا عملی ثبوت دیں اور جب تک بھارت مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے کوئی عملی پیش رفت نہیں کرتا اسے پسندیدہ ملک قرار دینے کی مہم جوئی ترک کی جائے۔ بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینا اور مسئلہ کشمیر کے حل کے وعدے دو متضاد رویے ہیں، دونوں آگ اور پانی ہیں۔ یہ دونوں رویے ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ اسی طرح کے تضادات کی وجہ سے پاکستان دولخت ہوا، مسئلہ کشمیر سرد خانے کا شکار ہوا اور ہمارا ملک تباہی سے دوچار ہوا ہے۔ سو سلامتی کی راہ یہی ہے کہ بے عملی چھوڑ کر عمل کی راہ اختیار کی جائے۔



کامیاب ازدواجی زندگی کے رَاہنما اُصول

چند اُصولوں کو اپنا کر ازدواجی زندگی کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے

حنا امجد

کہتے ہیں کہ شادی انسان کی زندگی کو ایک نیا موڑ دیتی ہے۔ ہم لوگ ایک اسلامی معاشرے میں رہتے ہیں اور ہمارے مذہب نے ہمیں زندگی گزارنے کا مکمل لائحہ عمل دیا ہے۔ شادی کے بعد لڑکا اور لڑکی دونوں کی زندگی میں بہت ساری تبدیلیاں آتی ہیں مگر بدقسمتی سے ان تبدیلیوں کے بارے میں پہلے سے کچھ بتایا نہیں جاتا اور جب انھیں یہ سب حالات پیش آتے ہیں تو وہ گھبرا جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بہت ساری غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ ذیل میں کچھ اصول بتائے گئے ہیں جن پر عمل کر کے میاں بیوی خاصی حد تک اپنی زندگی کو خوش گوار اور پرسکون بنا سکتے ہیں:

شادی کے پہلے 5 سال

شادی کے بعد لڑکی کا سب سے پہلے رابطہ اس کے شوہر سے ہوتا ہے۔ شروع شروع کا ایک ماہ تو بہت ہنسی خوشی گزر جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی اتنی ہی خوبصورت اور آسان ہے، مگر یہ سچ نہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ہمیں حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ لڑکیوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ وقت شوہر کی بات ماننے کا ہے نہ کہ اپنی بات منوانے کا۔ آپ کو شوہر جو بھی کہے اس پر مکمل اعتماد کا مظاہرہ کیجیے۔ اگر میاں بیوی چاہیں تو وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست بن سکتے ہیں، بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔

ایسے ہی لڑکے کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی اہلیہ کا مکمل طور پر خیال رکھے۔ لڑکی جو اپنے خاندان سے رخصت ہو کر اس کے عقد میں آئی ہے اس کی خواہشات کا لحاظ رکھنا اور اسے مکمل اعتماد میں لینا لڑکے کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔

شوہر کا بیوی پر مکمل اعتماد

میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے کی بنیادی وجوہات میں سے ایک وجہ شوہر کا اپنی بیوی پر اعتماد نہ کرنا ہے۔ لڑکی اگر اپنی نندوں میں



سے کسی کی غلط عادت کی اصلاح کرنا چاہتی ہے تو وہ اس کو اپنے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ سمجھتی ہیں۔ اس حوالے سے پھر وہ طرح طرح کی باتیں کرنا شروع کر دیتی ہیں کہ آج ہمارے گھر میں آ کر ہمیں سمجھانے لگ گئی ہے۔ پھر بات بات پر ایک دوسرے کو ٹوکنے کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ آخر کار اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بہنیں اپنے بھائی کو بھابھی کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیتی ہیں۔ بھائی اپنی بیوی سے اصل صورت حال پوچھنے کی بجائے بہنوں پر اعتماد کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان چپقلش شروع ہو جاتی ہے اور اکثر اوقات نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ ان تمام معاملات سے بچنے کے لیے شوہر کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی پر مکمل اعتماد کرے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تو اپنی بیوی سے اس فساد کی اصل وجہ معلوم کرے۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے پر اعتماد ہی ان کی ازدواجی زندگی کو پرسکون بنا سکتا ہے۔

شوہر کی گھر واپسی

یہ بات تو شرعی اعتبار سے بھی ثابت ہے کہ جب شوہر تھکا ہارا گھر واپس آتا ہے تو اسے ایک مکمل گھر کی امنگ ہوتی ہے کہ جہاں ہر چیز سلیقے سے رکھی گئی ہو، ایک صاف ستھری خوشبو سے آراستہ بیوی اس کا استقبال کرے تا کہ وہ اپنے سارے دن کی تھکن کو بھلا دے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شوہر کو اپنی پریشانیوں سے آگاہ نہ کریں بلکہ پہلے اس سے معلوم کریں کہ اس کا دن کیسا گزرا۔ اگر تو وہ سارا دن کافی پریشان اور الجھا رہا تو صبر سے کام لیں۔ شادی شدہ زندگی میں سب سے زیادہ اہم ہے کہ آپ بات کو کس موقع ومحل پر بیان کرتی ہیں۔

ایسے ہی شوہر کو چاہیے کہ گھر پہنچنے پر اگر وہ کوئی ایسی چیز دیکھے جو اسے پسند نہیں ہے تو صبر سے کام لے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اعتراضات کی بوچھاڑ اور دنگا فساد شروع نہ کر دے۔ اسے چاہیے کہ اس بارے میں اپنی اہلیہ سے استفسار کرے تا کہ اصل صورت حال سے آگاہی حاصل ہو۔

سسرال سے اچھے تعلقات

70 فیصد عورتیں سب سے پہلے یہی غلطی کرتی ہیں کہ شوہر کو اس کے ماں باپ سے بدظن کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ انسانی عقل اس بات کو کیسے مان لے کہ وہ ماں باپ جس نے ایک لڑکے کو پڑھایا لکھایا، تربیت کی، شادی کروائی، اس کی ہر ضرورت پوری کی، وہ شادی ہوتے ہی انھیں اپنا دشمن سمجھ بیٹھے۔ لڑکی کی کوشش ہونی چاہیے کہ اپنی ساس اور نندوں میں گھل مل جائے۔ اگرچہ یہ لڑکی کے لیے سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے مگر پھر بھی ناممکن نہیں۔ اور یہ بات یاد رکھیں کہ اگر لڑکی اپنی ساس ونندوں کا دل جیت لے تو اب شوہر کا دل جیتنا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں۔

ایسے ہی شوہر کو بھی چاہیے کہ وہ گاہے بگاہے اپنی بیوی کو اپنے والدین سے ملنے کی اجازت دے بلکہ چھوڑنے کے لیے جائے اور خود لے کر آئے۔ بیوی پر ایسی کوئی پابندی عائد نہ کرے کہ وہ اپنے ماں باپ سے بھی نہ مل سکے۔

قناعت پسندی

عقلمند بیوی وہی ہوتی ہے جو اپنے شوہر کی کمائی پر گزارہ کرے اور شوہر سے بار بار پیسوں کا مطالبہ کر کے پریشان نہ کرے۔ کوشش کیجیے کہ اپنا مہینہ وار بجٹ بنا لیں تا کہ آپ پیسوں کا ایک حساب میں رہتے ہوئے استعمال کریں۔ ایسے ہی شوہر کو بھی چاہیے کہ وہ شادی کے بعد اعتدال کے دامن کو تھامے رکھے۔ وہ اپنے آپ کو کچھ دکھانے کے لیے بے جا پیسہ نہ خرچ کرتا پھرے۔ شوہر کو فضولیات سے ہٹ کر اصل ضروریات پر توجہ دینی چاہیے۔

میکے جانے کے وقت اور دن کا تعین

ہمارے معاشرے میں ساس اور بہو کی لڑائی کی ایک اہم وجہ بہو کا اپنے ماں باپ کے گھر جانا ہے۔ ساس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بہو اپنے گھر میں اپنا دل لگائے اور اس کی خدمت کرے۔ دوسری طرف لڑکی یہ چاہتی ہے کہ اپنے ماں باپ کو بھی وقت دے۔ بے شک بہو چاہے جتنی بھی خدمت گزار کیوں نہ بن جائے، مگر جیسے ہی وہ میکے جانے کا ارادہ کرتی ہے تو ساس کے چہرے پر شکن پڑ جاتی ہیں۔ ان سب مسائل سے بچنے کے لیے لڑکی کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کی مدد سے اپنے میکے جانے کا دن متعین کرے۔ یہ بھی دھیان میں رہے کہ جو دن وہ مقرر کرے اس دن اس کے سسرال میں مہمانوں کی آمدورفت کم سے کم ہو۔

ایک دوسرے کے غصے کو برداشت کریں

شادی کے بعد ابتدائی ایام میں میاں بیوی ایک دوسرے کو نہیں سمجھ



پاتے مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ انسان ایک دوسرے کے موڈ، مزاج، عادات اور اخلاق کو سمجھ جاتا ہے۔ اگر شوہر غصے میں ہو تو بیوی کو چاہیے کہ خاموشی اختیار کرے۔ کیونکہ آدمی کا غصہ آگ کی طرح ہوتا ہے اور عورت کی تیزی جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔ اس لیے جب شوہر کسی بھی وجہ سے غصے میں ہو بیوی کو چاہیے کہ تحمل واطمینان سے کام لے۔

کسی بھی انسان کو ناپسندیدہ بات پر غصہ آ جانا ایک فطری چیز ہے۔ اگر بیوی کو بھی کسی بات پر غصہ آ جائے تو شوہر کو بھی تحمل مزاجی سے کام لینا چاہیے۔ ایسی بات نہیں کہ غصہ کرنا صرف شوہر کا حق ہے بلکہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے موڈ کو سمجھنا چاہیے اور ہمیشہ تحمل مزاجی سے کام لینا چاہیے۔

دوسروں سے اپنی زندگی کا موازنہ نہ کریں

عورت کی فطرت میں بنیادی طور پر حسد سب سے بڑھ کر نظر آتا اور مادہ پرستی پائی جاتی ہے۔ مگر یہاں ہمیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ ہر انسان کا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ حدیث نبوی ہے: ''نعمت میں اپنے سے کمتر کو دیکھو اور مصیبت میں اپنے سے زیادہ والے کو دیکھو تو شکر گزار بن جاؤ گے۔'' (صحیح مسلم: (9)- 2962)

کبھی بھی شوہر سے یہ مت کہیے کہ میری بہن کے پاس تو بڑی گاڑی، بڑا گھر ہے، پہننے کو اچھے سے اچھے کپڑے اور زیورات ہیں اور میرے پاس کیا ہے؟ کچھ نہیں۔ ایسی سوچ رکھنے والی لڑکیاں ہمیشہ گھر میں دنگا فساد کی جڑ بنتی ہیں۔ مال و دولت کی اسی حرص کی وجہ سے گھر سے سکون و اطمینان ختم ہو کر رہ جاتا ہے جس کے نتیجے میں ذہنی تناؤ اپنے پنجے جما لیتا ہے۔ آخر کار بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ گھر کے تمام افراد ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کچھ عطا کیا ہے اس پر شکر ادا کرنا سیکھیے اور قناعت پسندی اختیار کریں۔

ایسے ہی شوہر کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو طعن نہ کرے۔ اگر اس کے سسرال والوں نے اس کی کسی سالی کو جہیز میں زیادہ سامان دیا ہے یا اس کی بیوی کی نسبت کچھ اچھی چیزیں دی ہیں تو وہ اپنی بیوی کو ساری زندگی اس بات کے طعنے نہ دیتا رہے۔ اسے یہ کہہ کر اپنے والدین سے بدظن نہ کرے کہ انھوں نے تمھیں تو کچھ بھی نہیں دیا، سب کچھ تمھاری بہن ہی کو دیا ہے۔ بہر حال اس طرح کی تمام باتوں سے شوہر کو احتراز کرنا چاہیے تاکہ ان کی ازدواجی زندگی اپنے اندر خوشیاں بھر سکے۔

اپنے سسرال کے مسائل میکے میں بیان نہ کریں

اکثر اوقات لڑکیوں سے یہ بہت بڑی غلطی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سسرال کی باتیں اپنے میکے میں ہر کسی کو بتانے بیٹھ جاتی ہیں۔ اگر لڑکی کو اپنے سسرال میں کچھ مسائل کا سامنا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی والدہ کو اعتماد میں لے یا پھر اپنی بڑی بہن کو۔ کیونکہ وہ ان حالات سے گزر چکی ہوتی ہیں اور اس کی بہتر رہنمائی کر سکتی ہیں۔ کوشش کرنی چاہیے کہ سسرال اور میکے کے مسائل کو الگ رکھا جائے تب ہی زندگی آسان اور کامیاب ہو سکتی ہے۔

اوپر جو چند اصول ہم نے بیان کیے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کو بہترین اور کامیاب زندگی کا رنگ دیا جائے۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ اصل کامیابی اور اطمینان دینی تعلیمات پر عمل کر کے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ متذکرہ بالا اصول بھی اسی وقت کارگر ثابت ہو سکتے ہیں جب قرآن وسنت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا جائے۔ اس کے بعد ان اصولوں کو اپنایا جائے۔

کامیاب ازدواجی زندگی کے حوالے سے خصوصاً لڑکی کو ان باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے، اس لیے کہ شادی کے بعد وہ سب سے زیادہ وقت اپنے خاوند ہی کے گھر میں گزارتی ہے، خاوند کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا اس کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔

اندھے کے ہاتھ میں چراغ

ایک شخص نے بتایا کہ ایک دفعہ دوران سفر میں ایک بستی میں ٹھہرا۔ رات کے وقت جب میں کسی ضرورت سے باہر نکلا تو میں نے ایک اندھا دیکھا جس کے کندھے پر پانی کا مٹکا تھا، اور وہ ہاتھ میں چراغ لیے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا: ''اے فلاں! تمھارے لیے دن اور رات دونوں برابر ہیں، پھر یہ چراغ ساتھ لے کر چلنے کا کیا مطلب؟'' اندھا بولا: ''احمق انسان! میں نے چراغ اپنے ساتھ اس لیے رکھا ہے تاکہ تمھارے جیسے بیوقوف اس چراغ کی روشنی میں مجھے دیکھ لیں اور مجھ سے نہ ٹکرائیں، پھر میں بھی گروں اور میرا مٹکا بھی ٹوٹ جائے۔'' (نکت الهميان في نكت العميان، ص: 118)



ادب کے نام پر
اخلاقی تباہ کاریاں

سورۃ الشعرآء کی روشنی میں شاعروں اور ادیبوں کے لیے تنبیہات

ابوفراز اصغر علی صابر

سورۃ الشعرآء کی آیات کا مفہوم یہ ہے کہ شعر میں جھوٹ اور مبالغہ آمیز باتیں نہ کہی جائیں اور اشعار میں جو کام کی باتیں پیش کی جائیں ان پر کہنے والے کی طرف سے عمل بھی کیا جائے (شعر وشاعری میں فخر، غرور، گھمنڈ، تکبر اور لاف زنی جیسے شیطانی اثرات سے بچنے کے لیے) اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا جائے، دین حق کی مدافعت کی جائے اور (مبالغہ آمیز انتقامی ہجو اور بڑھ چڑھ کر ڈینگیں مارنے کے بجائے) اپنے کلام کے ذریعے ظالموں کے ظلم کا جواب دیا جائے۔ (معنی و مفہوم سورۃ الشعرآء آیت نمبر 224 تا 227)

جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شعر میں اچھائی اور حکمت کی بات بیان کی جائے۔'' (صحيح البخاري: 6145) صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں خلاف شرع شعر کہنے اور خلاف شرع شعر پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

اس روشنی اور بصیرت افروز راہنمائی کے باوجود ہمارے ادیب اور شعراء جو گل کھلا رہے ہیں، زیرِ نظر سطور میں اسی موضوع پر مختصراً بات کی گئی ہے۔ اردو ادب میں شاعری کے اعتبار سے اہم ترین صنفِ سخن غزل ہے اور عاشقانہ شاعری میں روحانیت، صوفیت اور رومانویت کی حیا باختہ آمیزش و امتزاج کو ''غزل'' کہا جاتا ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہے اور ''غزل'' ہرن کی اس آخری دلدوز چیخ کو بھی کہتے ہیں جب شکاری کتوں نے اس کی تکا بوٹی کرنے کے لیے اس کو اپنے مونہوں اور پنجوں میں دبوچ لیا ہو۔ جن مضامین میں عام طور پر غزل کہی گئی ہے یا کہی جا رہی ہے وہ بے حیائی اور اخلاقی گراوٹ کا مظہر ہوتے ہیں، مثلاً: عاشق کی حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، گل و بلبل کے راز و نیاز، وحشت و جنوں، عشق کی بلا خیز، معشوق کے سراپا کی تعریف، اسی تناظر میں باغ و بہار کے مناظر، بادۂ گلفام کی تعریف و طلب، تخیل کی پستی، افسانویت، تباہی و بربادی، رونا دھونا، آہ و زاری، حزن و یاس، غنائی کیفیت، خونِ جگر، لطفِ نظر، سینہ شگافی، چاک گریباں، عشوہ، غمزہ، محبت کا جوار بھاٹا، شراب و شباب، گھنگرو اور پائل کی جھنکاریں، تاک جھانک، گھر کی چلمن، مے خانے کی غلام گردش، دردِ فراق، معشوق کے جور و جفا، رنج و الم، رقیبوں کی نوک جھونک، کنج تنہائی، دیوانگی، کیف و مستی، نغمہ و سرود، محبوبوں کی سرد مہریاں، دل جلوں کا طعن و تشنیع، نامہ و پیام، قاصد کی آنیاں جانیاں، تصویر و تصور، موسیقی و سماع، وجد بے خودی، ترک تعلق، رسوائیاں اور شہنائیاں، بے زاری و بے قراری، اجڑے نگر، شمع مفلس، چراغِ گور، ویرانۂ صحرا، بسترِ مرگ تک حسرتیں ہی حسرتیں، زمانے کی جفا کاری، دربدری، خاک بسری اور آتش خاموش وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ قلم کی رو میں بہہ کر نہیں لکھا جا رہا بلکہ مغلیہ سلطنت کے انحطاط سے لے کر قیامِ پاکستان اور قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک اور بہت حد تک الا ماشاء اللہ اردو ادب کی یہی تصویر اور یہی رخ پیش کیا جا رہا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی جمالیاتی حس کی تسکین کے لیے یہ شاعر اور ادیب حضرات کبھی زمین کے ساتھ لپٹتے، کبھی نگر نگر گھومتے، ذوقِ نظر کی آبیاری



کرتے ہوئے نظر آئیں گے جو حسن کلام کو کسی ٹھوس فلسفے یا نظریاتی عقیدے کے اظہار کا وسیلہ نہیں بناتے بلکہ فن کو حسن کی توصیف کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور نئی کتابِ عشق کے نئے صفحے پر رقم حسن و عشق کے نت نئے نغمے نئے لہجے میں گانے لگ جاتے ہیں۔

ہر ابتدا انتہا تک جانے کا راستہ ہوتی ہے اور عورت کو ذلت کی طرف بلانے میں شاعروں کے وضع کردہ ادب نے نہایت بھیانک کردار ادا کیا ہے۔ فتنہ زدہ ادب کے سہارے چیخنے والوں نے شیطان فطرت شاعروں کو اپنا رہبر قرار دے کر حیاء اور شرم کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ادب کے نام پر صدیوں سے یہ تکلیف دہ صورت حال جاری ہے لیکن ان لوگوں کو بے نقاب کرنے اور ان کے تعاقب میں جلتے انگارے داغنے کا کوئی مربوط اور موثر سلسلہ نہ ہونے کی بنا پر یہ لوگ قوم کے مجموعی مزاج پر حاوی نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس میدان میں خالصتاً غیر مسلم بھی ہیں لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو نام کے اعتبار سے مسلمان ہیں لیکن ملتِ اسلامیہ کو بے لباس کرنے میں شیطانی مشن کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی نظم اور نثر اسلام کی فلک بوس عمارت کی بنیادیں کھودتی نظر آئے گی۔ مذہب اور اخلاق سے بے گانہ لوگوں کے دلوں میں خواہشِ نفس اور ادب برائے ادب کے مقصد کی بے مقصدیت بھری ہوئی ہے۔ بے دینی اور کفر و الحاد کے یہ ترجمان اقلیمِ سخن کے سنگھاسن پر بیٹھ کر امت مسلمہ میں اپنے باطل اور فحش افکار ٹھونسے جا رہے ہیں۔ دل غم واندوہ اور افسوس سے بھر جاتا ہے کہ اس طرح کے گمراہ لوگ اپنے قلموں کے ساتھ ملت اسلامیہ کے معصوم نونہالوں اور تقدس مآب پیاری بیٹیوں کی ادب کے نام پر بربادی کر رہے ہوں۔

ڈاکٹر سلیم اختر ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں لکھتے ہیں: ''دکن ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ بھی اسی علاقہ کی تھی۔ اس ضمن میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں: ''اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ماہ لقا چندا (1181ھ ۔ 1240ھ) سمجھی جاتی ہے۔ اس کا دیوان پہلی مرتبہ 1213ھ میں مرتب ہوا جو انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔'' شفقت رضوی نے ''دیوانِ ماہ لقا چندا بائی'' مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ چندا اپنے وقت کی امیر ترین خواتین میں شمار ہوتی تھی۔ فن موسیقی، رقص اور محفل آرائی کے فن میں طاق تھی۔ عمر بھر شادی نہ کی۔ شاعری، تاریخ، شہ سواری اور تعمیرات سے خصوصی شغف تھا۔ نواب میر نظام علی خاں کی منظور نظر تھی۔ اس لیے چھوٹے موٹے کو منہ نہ لگاتی۔ الغرض! تمام دکن میں اس کی شہرت تھی، چنانچہ انتقال کے بعد وہیں دفن ہوئی۔ نمونہ کلام:

ثابت قدم ہے جو کوئی چندا کے عشق میں
صف میں وہ عشق بازوں کی سالار ہی رہا

اسی دکن کی سرزمین کو یہ ''اعزاز'' بھی حاصل ہے کہ اردو کے پہلے معروف شاعر ولی دکنی نے سرزمین گجرات (بھارت) میں جنم لیا جس کی ننگی اور بازاری غزلوں کے چرچے آج تک زبان زد خاص و عام ہیں۔

رام بابو سکینہ نے تاریخ ادب اردو میں





کلاسیکل اردو کے نمایاں شاعر خواجہ میر درد کے بارے میں لکھا ہے: ''ایک صوفی اور درویش منش شاعر تھے، محمد حسین آزاد ''آبِ حیات'' میں اسی درویش منش انسان کے ''فضائل و مناقب'' بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''موسیقی میں اچھی دستگاہ تھی۔ بڑے بڑے با کمال گویے اپنی چیزیں بنظر اصلاح لاکر سنایا کرتے تھے۔ معمول تھا کہ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیس تاریخ کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت (ڈوموں کی ایک خاص قسم) ڈوم، گویے اور صاحب کمال اہلِ ذوق جمع ہوتے تھے اور معرفت کی چیزیں بجاتے تھے۔ ان کی مرید بہت سی کنچنیاں (کنجریاں) بھی تھیں۔ سخن درد کی دیگ سے ایک دانہ ۔

قتلِ عاشق کسی معشوق سے دور نہ تھا
پر تیرے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رام بابو سکسینہ اپنی مشہور تصنیف ''اردو ادب کی تاریخ'' میں میر تقی میر کے بارے میں ''تذکرہ میر'' نامی کتاب کے حوالے سے لکھتا ہے:

''میر صاحب کہتے ہیں کہ میرے والد نے، جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے، درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ رہے۔ مجھے تلقین کی کہ اے بیٹے! عشق کو اپنا کیونکہ کائنات میں عشق کا تصرف ہے۔ اگر عشق نہ ہو تو یہ نظام درہم برہم ہو جائے۔ عشق کے بغیر زندگی وبال جان ہے اور عشق سے بھرا دل کمال کی علامت ہے۔ عشق کے ساتھ زندگی بنا اور عشق میں جل جا۔ دنیا کی ہر چیز عشق کے باعث ہے، عشق کے بغیر کچھ نہیں، عشق کے بغیر زندگی ہی نہیں۔'' اس غلیظ نصیحت کا موازنہ ذرا اس نصیحت سے کریں جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ لقمان میں فرمایا: ''وہ وقت بڑا قابلِ ذکر اور قابلِ غور ہے جب حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے پیارے بیٹے اپنے چھوٹے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ بیٹا! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے ..... اور اس طویل نصیحت میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت اور باریک بینی سے خبردار کیا۔ نماز اور اوامر و نواہی کی تلقین کی اور پیش آمدہ مصائب کو حوصلے کے ساتھ جھیلنے کی ترغیب دی۔ بے رخی، متکبرانہ طور طریقوں اور چالوں سے بچ جانے کا درس دیا، چال ڈھال اور آواز میں وضع داری اور انکسار کی طرف توجہ دلائی۔ چیخنے چلانے اور کرخت آواز کو گدھے کے رینکنے سے تشبیہ دی۔'' (خلاصہ سورۃ لقمان آیات 14 تا 19) جبکہ اس کے برعکس میر کا باپ کیسی مخرب الاخلاق تربیت کر رہا ہے اور پھر یہ ''سعادت مند'' بیٹا اپنے باپ کی نصیحت پر کچھ اس طرح پورا اتر کر ''خدائے سخن اور شہنشاہِ غزل'' کہلایا ۔

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھا
سارے عالم میں پھر رہا ہے عشق
عشق معشوق، عشق عاشق ہے
یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
اور تدبیر کو کچھ نہیں ہے دخل
عشق کے درد کی دوا ہے عشق

میر حسن دہلوی مصنف ''باغ و بہار'' اپنی کتاب ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں اردو ادب کے ایک معروف شاعر شیخ قلندر بخش جرأت کی عاشقانہ جرأت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''جرأت مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ فنِ شاعری کے علاوہ نجوم میں ماہر اور فنِ موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے۔ افسوس ہے جوانی ہی میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ بعض کہتے ہیں یہ حادثہ چیچک سے ہوا، بعض کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں (وہ دوسری وجہ آپ کے سامنے آ رہی ہے) مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں اس کو بہت طول دے کر لکھا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہمارا نوجوان عاشق مزاج شاعر جنس نازک کی پر لطف صحبتوں کا بہت دلدادہ تھا مگر پردے کے سبب شرفا اور امرا کے گھروں میں گھسنے نہیں پاتا تھا۔ ایک مرتبہ آشوبِ چشم کے بعد مشہور کر دیا کہ میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور مجھ کو اب کچھ نہیں سوجھتا۔ اس بہانے سے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کے جانے لگا اور خوبصورت عورتوں کو چپکے چپکے تاکنے لگا۔ آخر کار اپنی اس بدکاری کی پاداش میں سچ مچ اندھا ہو گیا۔'' موصوف نے اپنی کتب میں ایک یادگار چیز ''حسن و عشق'' نامی مثنوی چھوڑی ہے جس میں ایک شخص خواجہ حسن اور لکھنؤ کی ایک حسین رنڈی ''بخشی'' کا ذکر ہے جس میں اس قصے کو مزے اور چسکے لے لے کر بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کلام

اٹھے جہاں سے نہ جرأت اٹھا کے دردِ فراق



الٰہی موت بھی آئے تو وصلِ یار میں آئے
مل گئے تھے ایک بار اس کے حویرے لب سے لب
عمر بھر ہونٹوں پہ اپنے میں زباں پھیرا کیا
سامنے سجدہ ریز ہونا چاہتا ہوں
جو میری ہفوات کو پسند کرتا ہو
استغفر اللہ!

ان شاعروں نے حکام، امراء ونوابین اور راجوں مہاراجوں کے بارے میں ایسے ایسے قصیدے لکھے ہیں کہ ان کو پڑھ کر ان کی ذہنی پستی سے گھن آتی ہے۔ آپ خود ہی سوچیں جو چند ٹکوں کے لیے قصیدے کی آڑ میں اپنی غلامی کی بھیک مانگ رہا ہو وہ ایسے نظامِ حیات کا کیسے داعی ہوسکتا ہے جس کا اولین مقصد بندہ و آقا کا امتیاز مٹانا ہو؟ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ شرق وغرب کے طاغوتوں کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ان کے پیرہنِ غرور کو تار تار کر دے؟ جن کی جبینِ نیاز امارتوں اور وزارتوں کے بلند و بالا ایوانوں کے سامنے جھک جاتی ہو اور اپنے ہی جیسے بندوں کو خدائی کا دعویدار بنا دیتی ہو، کیا وہ ایسے نظام کی طرف پیش رفت کریں گے جو صدیوں سے راعی اور رعایا کے درمیان کھڑی دیواروں کو توڑ دے؟ قصیدوں اور مرثیوں کے لکھنے والے اور صرف لفظوں کے دھنی جہادی زندگی کی آزمائشوں، کوہساروں، صحراؤں کی کلفتوں اور اسیری کے مصائب وآلام سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں؟ نقاد ان قصیدوں کی خیال آرائیوں کو جو بھی خلعتِ فاخرہ پہنائیں لیکن غیور قوموں کی لغات میں قصیدہ پڑھنے والے کی خوشامد کے اندر چھپی ہوئی بے بسی اس کی بھوک پیاس اور اخلاقی پستی کا پتہ دے رہی ہوتی ہے۔ مخاطب کی شجاعت اور بہادری کے گن گانے والی بزدلی، حاکم کی دولت و ثروت کا شہرہ بیان کرنے والی مفلسی اور حضورِ معلّٰی کی فیاضی اور دریا دلی کا چرچا کرنے والی بے مائیگی اپنے تمام تر قرینوں کے ساتھ نظر نہ آنے کے باوجود نظر آ رہی ہوتی ہے۔

اردو ادب کی اخلاقی تباہ کاریوں میں سے ایک تباہ کاری یہ بھی ہے کہ حسن وعشق پر مبنی جھوٹے قصوں کو ناول اور افسانہ ایسی اصناف سخن کا لسانیاتی تحفظ دے کر دائمی پذیرائی دی گئی ہے۔ 1801ء میں جان گلکرائسٹ کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قائم کیے جانے کی وجہ انگریزوں کو اردو زبان سکھانا تھا تاکہ کہانیوں کی دلچسپی کے جلو میں زبان دانی کا مقصد حاصل ہو سکے، چنانچہ سامراجی آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میراثی قسم کے ادیبوں کی کھیپ نے محیر العقول اور مافوق الفطرت واقعات پر مبنی فرضی داستانوں پر مشتمل کتابیں لکھیں جن میں میر امّن کی باغ وبہار اور گنجِ خوبی، حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل اور طوطا کہانی، خلیل خان اشک کی داستانِ امیر حمزہ، بہادر علی حسینی کی بے نظیر، للولال کوی کی سنگھاسن بتیسی، میاں محمد بخش مہجور کی نورتن، پنڈت رتن ناتھ سرشار کی فسانۂ آزاد، رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب، نیم چند کھتری کی گلِ صنوبر، الف لیلہ، بوستانِ خیال، طلسم ہوشربا جبکہ سخن دہلوی کی سروشِ سخن بہت مشہور ہوئیں۔

ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے استعماری اور مذہبی مقاصد پر نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

''فورٹ ولیم کالج کے قیام کا ایک اور مقصد تصنیفات کے ذریعے ہندوستانی رعایا پروری کا نقش قائم کرنا بھی تھا۔ بظاہر فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کہانی، تاریخ، شاعری اور قانون کی اصناف پر محیط ہیں، تاہم مصنفین نے ان کتابوں میں جو دیباچے اور خودنوشت حالات لکھے ہیں ان میں سرکارِ انگلشیہ، لارڈ ویلزلی اور ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی تحسین اور قصیدہ گوئی میں کوئی کسر نہیں رکھی گئی ہے، چنانچہ ان کتب کے ذریعے ہندوستانی مصنفین نے رعایا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ محکومی کے باوصف ایک مخیّر اور منصف حکومت کے زیرِ سایہ خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر سلیم اختر نے ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں ان ادیبوں اور شاعروں کے ادبی پہلوؤں کے علاوہ ان کے ذاتی اور اخلاقی کردار کے چند گوشے بھی بے نقاب کیے ہیں۔ غالب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے طوائفوں اور ڈومنیوں کے ساتھ یارانے تھے۔ مکاتیبِ غالبؔ اس بدیہی حقیقت کے عکاس ہیں کہ رنگ برنگ شرابیں پینے والا یہ عیاش بے نماز، روزہ خور اور دین بے زار آدمی تھا۔ یہی ''اوصافِ حسنہ'' اس کی شاعری سے مترشح ہیں۔

واکر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

قرض کی پیتے تھے مے اور کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا یاد نہیں

اسی طرح موصوف حکیم مومن خان مومن کے



بارے میں لکھتے ہیں کہ یوں تو ان کا ''صاحب بی بی'' سے عشق زیادہ مشہور ہے لیکن اور بھی نصف درجن کے قریب افیئرز (یعنی معاشقے) ثابت ہیں۔ مرقع کلام میں سے ایک جھلک ؎

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک؟

قیامِ پاکستان کے بعد کے شعراء بھی وہی گندہ، پستی کا مارا ہوا اور سرسام زدہ ادب تخلیق کرتے رہے، مثلاً:

نہ اتنا تیز چلے سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتہ دکھائی دیتا ہے
مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دیا ہوں

یہ بھی صحیح ہے کہ معدو دے چند شاعروں نے عشق مشک کی خباثتوں سے ہٹ کر طبع آزمائی کرتے ہوئے معاشرتی، سیاسی، سماجی حالات کو بھی شاعری کا حصہ بنایا ہے جیسے ڈاکٹر اقبال، حالی، مولانا ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ لیکن نفسِ مضمون کی نوعیت کے اعتبار سے یہ استثنائی صورتیں ہیں۔

مندرجہ بالا مبحث سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ اس طرح کا ادب پڑھ کر محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کے سپوت خالد بن ولید، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، صلاح الدین ایوبی، یوسف بن تاشفین، نور الدین زنگی اور سلطان محمد فاتح بنیں گے یا بھانڈوں، ڈوموں اور میراثیوں کے سے لچھن اختیار کریں گے۔ حقیقت اور سچائی سے عاری ادب قطعی کھوکھلا، بے اثر، بے معنی اور اخلاقی قدروں کے لیے زہر ہلاہل ہوتا ہے، انسانی زندگی اور جہان رنگ و بو کی تلخ وشیریں صداقتوں کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔

ہمیں تاریکیوں میں لے جانے والے کالے ادب کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو اس ادب کی ضرورت ہے جو ہمیں یہ بتائے کہ قومیں صرف بیرونی جارحیت ہی سے ہلاک نہیں ہوتیں بلکہ جب تک ان کا ذہنی حصار قائم رہتا ہے وہ کسی بڑی سے بڑی شکست کو بھی آخری شکست تسلیم نہیں کرتیں۔ ہمیں ایسے ادب اور ایسے ادبی دانشوروں کی ضرورت نہیں جو ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ دَیر و حرم، ملا و پنڈت، مسجد و مندر، رب رحمان اور پرماتما بھگوان ایک ہیں۔ ہمیں کوئی خواہش نہیں ایسے ادب کی جو بے عملی اور خود سپردگی کا خنجر ہمارے نونہالوں کی شہ رگ میں ادب کے نام پر اتارتا چلا جائے، جس کے رومانوی افسانوں اور ہوس کاری کے مظہر انشائیوں کی جادوگری ہمارے ملی حصار کی نظریاتی بنیادوں کو تباہ کر دے۔ ہم بے زار ہیں ایسے ادب سے جو کفر و اسلام کے درمیان صدیوں سے حائل ذہنی فاصلوں کو مٹا کے رکھ دے، جو مادھو رام جوہر، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، راج نرائن آنند، کالی داس گپتا، میرزا و میر، مومن و غالب، ذوق و داغ، آتش و ناسخ، مجاوز و حسرت، غلام اللہ اور بھگوان داس کو ایک ہی پلیٹ فارم پر ایک ہی صف میں کھڑا کر دے۔ ہمیں کوئی تمنا اور آرزو نہیں ایسے ادب کی جو اخلاقیات سے عاری تہذیبوں کی یلغار کے راستے کھول دے۔ ہم ایسے ادب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کی خوشنما زردی اور ریشم آسا نرمی آکاش بیل کی طرح ہو جو بے خبر، ہنستے مسکراتے ہرے بھرے پھولدار و پھلدار پودوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر ہولے ہولے زندگی سے محروم کر دیتی ہے، ایسا ادب جو اس امربیل کی طرح خود تو قطعی طور پر بے بنیاد ہو لیکن تناور اور گہری جڑیں رکھنے والے درخت کو موت کے منہ میں لے جائے۔

ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے جو زندہ قوموں کی عزت اور آزادی کے راستوں کا نقیب ہو، جو تلواروں کی تیز دھاروں پر چلنے کا عزمِ صمیم سکھا دے، جو ٹوٹے ہوئے تاروں کو مہِ کامل بنا دے، جو شاہراہِ حیات کے قافلوں کو وقت کی تند و تیز آندھیوں اور خوفناک اور مہیب اندھیروں میں بھی درست سمت راہنمائی کرنے میں ممد و معاون ہو، جو حوادثاتِ زمانہ کے شکار پست ہمت انسانوں کو مہمیز غیرت لگا کر اپنے خون سے امیدوں کے چراغ جلانے کا حوصلہ دے، جو ایسا شعور اور نور دے کہ حلقۂ موج و تلاطم میں بھی سلامتی کی منزل نظر آتی ہو۔ جو حوصلہ شکن تاریکیوں میں ایمان و عمل کی مشعل روشن کر دے۔ بلاشبہ ہمیں ایسا ادب مرغوب و مطلوب ہے جو معاشرتی برائیوں کے خوفناک گڑھوں، بھیانک تاریکیوں اور خطرناک طوفانوں سے ملت اسلامیہ کو آگاہ کرے، ڈگمگا کر طوفانوں اور ظلمتِ شب میں سہم کر رہ جانے والوں کو فکری استقلال مہیا کرے، جو شیطانی قوموں کی آئینہ دار نام نہاد سپر طاقتوں کے وضع کردہ سیاہ ضابطوں کو بے حجاب و بے نقاب کرے اور جو مکر و فریب کے ہتھیاروں سے مسلح یہود و ہنود اور صلیب کے پجاریوں کی مکاریوں کو تشت از بام کر دے۔



① مشہور واقعات کی حقیقت



تالیف: ابوعبدالرحمٰن فوزیم

مترجم: محمد صدیق رضا ناشر: مکتبہ اسلامیہ

غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ 042-37244973

180 صفحات کی یہ معلوماتی کتاب 73 ایسے مشہور واقعات پر مشتمل ہے جو سنداً ثابت نہیں ہیں۔ جبکہ ان میں کچھ ایسے واقعات بھی ہیں جن پر بہت سے بنیادی احکام کے متعلق استدلال بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً: سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا مشہور قصہ جس میں انھوں نے کہا تھا: ''میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔'' اس واقعے کو بہت سے لوگ تقلید کی دلیل بناتے ہیں مگر یہ قصہ ثابت نہیں۔ مؤلف نے اس واقعے کے 17 تفصیلی حوالے لکھ کر اس کے ضعف کی وجوہات ذکر کی ہیں۔ علاوہ ازیں ہر حدیث یا واقعے کے متعلق ارباب تحقیق کے اقوال بھی ذکر کیے ہیں۔ اس میں محض عہد نبوی ہی کے واقعات کا تذکرہ نہیں بلکہ صحابہ و تابعین کے عہد کے مشہور واقعات کی استنادی حیثیت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ مولانا مبشر ربانی حفظہ اللہ نے تقریظ میں لکھا ہے کہ ''ہمارے خطباء وواعظین کو بالخصوص اور عامۃ الناس کو بالعموم اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

② سیرۃ المصطفیٰ ﷺ 3 جلدیں



(نظرثانی شدہ جدید ایڈیشن)

تالیف: مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ۔

ناشر: زمزم پبلشرز، شاہ زیب سنٹر،

اُردو بازار کراچی۔ 021-32760374

زیر تبصرہ کتاب کی تین جلدیں 1225 صفحات اور 16 ابواب پر مشتمل ہیں۔ یہ کتاب علوم و معارف کا مرقع اور حب نبوی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں سیرت سے متعلقہ احکام ومسائل اور اہم مباحث کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور بہت سے عمدہ نکات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی بھرپور دفاع کیا گیا ہے۔ اور شیعہ کے مختلف اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، مثلاً: حدیث میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہونے کا ذکر ہے اور شیعہ حضرات نے اس بات کو لے کر فرمان نبوی کی روشنی میں «فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّي مَنْ أَغْضَبَهَا فَقَدْ أَغْضَبَنِي» حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا ہے جبکہ مؤلف نے بڑے علمی انداز میں اس کا جواب دیا ہے کہ ''غضب'' (غصہ آ جانا) اور ''اغضاب'' (غصہ دلانا) میں فرق ہے۔ اس قسم کے سیکڑوں علمی نکات اس میں موجود ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ چونکہ مؤلف کا موقف ہے کہ نبی ﷺ اور دیگر انبیاء اپنی قبروں میں حیات ہیں، انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور تفصیل سے بحث کی ہے اور بہت سی ناقابلِ حجت احادیث بھی ذکر کی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ ''آں حضرت ﷺ نے بحکم ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوتِ﴾ تھوڑی دیر کے لیے موت کا مزہ چکھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ کر دیا.....'' (سیرۃ المصطفیٰ ﷺ: 221/3) ایسے اساطینِ علم کو یہ



انداز زیب نہیں دیتا۔

کتاب میں اس قسم کی زلّات نہ ہوتیں تو بہت بہتر تھا۔ زمزم پبلشر نے جدید ایڈیشن میں مؤلف کے صاحبزادے ڈاکٹر میاں محمد صدیقی صاحب کا مقدمہ بھی شامل کرایا ہے، تصحیح کا اہتمام بھی کیا ہے، اعراب بھی لگوائے ہیں اور جدید قواعد املا کا خیال بھی رکھا ہے۔

③ غیر اسلامی تہوار

(تاریخ، حقائق، مشاہدات)

تالیف: محمد اختر صدیق،

ناشر: مکتبہ اسلامیہ، اُردو بازار، لاہور



کفار کی نقالی میں امت مسلمہ بہت آگے نکل چکی ہے اور مغربی کلچر مسلمانوں کے علاقوں میں تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ انھی میں سے ایک مسئلہ دن یا تہوار منانے کا ہے۔ اگر مغربی کلچر کے سیلاب کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو ممکن ہے نئی نسل اس میں بہہ جائے۔ انھی انتظامات میں سے ایک اہم کاوش زیر تبصرہ کتاب کی صورت میں ہے۔ اس میں ''بسنت، ویلنٹائن ڈے، خواتین کا عالمی دن، اپریل فول، یوم مزدور، ماؤں کا عالمی دن، آبادی کا عالمی دن، عالمی یومِ انسداد منشیات اور کرسمس ڈے'' کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اللہ مؤلف اور ناشر کی کاوشوں کو بارآور کرے۔ آمین

یومِ یکجہتی کشمیر

آباد ہے در حقیقت ''پاکستان'' کشمیر میں
قرونِ اولیٰ کی سُو تم داستاں کشمیر میں

خوں سے رنگیں ہو گئی ہیں وادیاں کشمیر میں
ہر سہاگن نے بھی دی قربانیاں کشمیر میں

منتظر ہیں ابنِ قاسم بیٹیاں کشمیر میں
قربانیاں ہے دے رہی ہر ایک ماں کشمیر میں

بن گئی ہیں شیرنی سب ناریاں کشمیر میں
اقبال کا شاہیں بنا ہر نوجواں کشمیر میں

ہر جگہ ہیں ڈٹ گئے مرد و زناں کشمیر میں
اور نہتے کھا رہے ہیں گولیاں کشمیر میں

حق پرستوں کا ہے جاری امتحاں کشمیر میں
پھٹ گیا نمرود کا آتش فشاں کشمیر میں

ہندو ظالم ٹِک سکے گا اب کہاں کشمیر میں
پائے گا نہ وہ کہیں جائے اماں کشمیر میں

کچھ نکمّے توڑتے ہیں روٹیاں کشمیر میں
OPTION ہیں دیتے پھرتے بے ایماں کشمیر میں

ہند کا جو بھی بنے گا ترجماں کشمیر میں
دیکھنا مٹ جائے گا اس کا نشاں کشمیر میں

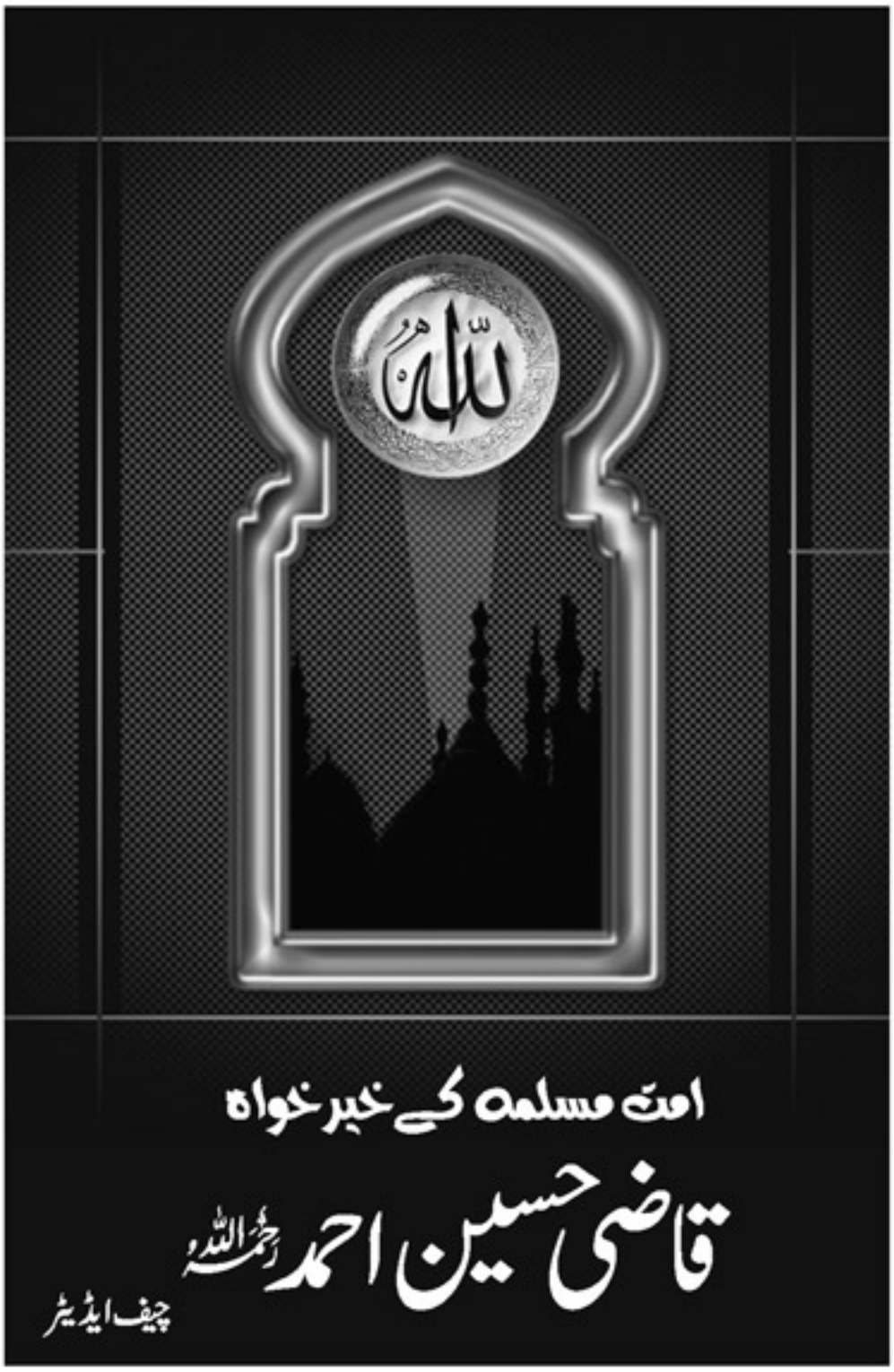
ہو گئے بدنام ہمارے حکمراں کشمیر میں
اُن سے جنت ہو چلی ہے بدگماں کشمیر میں

حق و باطل کی ہے جاری جنگ وہاں کشمیر میں
جنگ کرسی کی بپا ہے پر یہاں کشمیر میں

رحم کر اے مالکِ کون و مکاں کشمیر میں
خونِ شہدا جائے گا نہ رائیگاں کشمیر میں

دیکھ لی ہے دنیا نے مومن کی شاں کشمیر میں
لا الہ ہے نعرہ زن ہر مسلماں کشمیر میں

(میر وقار عزیز، راولپنڈی)



6 جنوری 2013ء اتوار کی صبح میں لاہور سے واربرٹن کے لیے روانہ ہوا، میں چند دن پہلے پاکستان پہنچا تھا۔ بائی پاس پر جناب حاجی سعید ورک صاحب کا پٹرول پمپ ہے۔ وہاں پر پٹرول ڈلوانے کے لیے رکے تو پٹرول پمپ کے مالک جناب حاجی سعید ورک صاحب آگئے۔ گلے سے لگا لیا اور کہنے لگے کہ آپ کو اطلاع مل چکی ہوگی کہ محترم قاضی حسین احمد صاحب آج رات اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مجھے یقین نہ آیا۔ بتانے لگے کہ آج رات اسلام آباد میں ان کو دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس روز ہمارا شیڈول پہلے سے طے شدہ تھا۔ بہت سارے لوگ انتظار میں تھے۔ اس روز ایک مسجد کا سنگ بنیاد اور ایک کا افتتاح کرنا تھا ورنہ اصولی طور پر ان کے جنازے میں شرکت کے لیے مجھے بھی جانا چاہیے تھا۔ قاضی حسین احمد صاحب ان شخصیات میں سے تھے جنھوں نے ایک منفرد انداز میں جماعت اسلامی کے کام کو آگے بڑھایا۔ ان کی سیاست سے کوئی لاکھ اختلاف کرے مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ انھوں نے پاکستان میں دینی جماعتوں کی سیاست میں ایک منفرد رول ادا کیا۔ ان کے سامنے ایک بڑا مشن تھا جس کے لیے وہ ساری زندگی جدوجہد کرتے رہے۔

قاضی صاحب ایک مدت تک سینیٹر اور پھر قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ وہ ان دونوں پلیٹ فارموں پر اپنے مخالفین کو للکارتے اور حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہے۔ جماعت اسلامی مخصوص نظریے اور سوچ کے حامل مخصوص وضع قطع والے لوگوں کی جماعت تھی لیکن قاضی صاحب نے اس کو سیاسی اور عوامی جماعت بنانے کی بھر پور کوشش کی۔ میں نے یو ٹیوب پر ان کی بعض تقاریر کو سنا ہے۔ انھیں علامہ اقبال اور ان کے افکار سے بے حد محبت تھی۔ ان کے سینکڑوں اشعار انھیں یاد تھے۔ اپنی تقاریر میں وہ ان کا خوب استعمال کرتے۔ ان کی خواہش تھی کہ پاکستان کو علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ترقی دی جائے۔

خاصا عرصہ پہلے میں سعودی عرب سے پاکستان چھٹی پر گیا ہوا تھا، ان دنوں اسلام آباد میں قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ محترم پروفیسر ساجد میر صاحب، امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث کی وساطت سے مجھے بھی مہمانوں کی گیلری کا پاس مل گیا۔ اس روز قاضی صاحب کی بھی تقریر تھی۔ قاضی صاحب کی تقریر پہلی مرتبہ میں نے اسمبلی میں سنی۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر بے باکی سے بات کرتے ہیں۔ ان کے دلائل بڑے زوردار تھے۔

جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی اور محترم میاں طفیل محمد جیسی قد آور شخصیات کے بعد جماعت کی قیادت سنبھالنا کوئی سہل کام نہ



تھا۔لیکن قاضی صاحب نے یہ ذمہ داری اس آن بان کے ساتھ نبھائی کہ ان کے ساتھ اختلاف کرنے والوں کو بھی داد دینا پڑی۔

2008ء کی بات ہے کہ وہ رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے سعودی عرب تشریف لائے تھے۔ اجلاس میں شرکت کے بعد وہ ریاض تشریف لائے۔ ان دنوں وہ جماعت اسلامی پاکستان کے امیر تھے۔ میری خواہش تھی کہ وہ دارالسلام کے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کریں، چنانچہ برادرم حافظ عبدالوحید صاحب کی وساطت سے ان تک میری خواہش پہنچائی گئی جو انھوں نے قبول فرمالی۔ یہ ان کا بڑا پن اور ہمارے ساتھ محبت کا انداز تھا کہ انھوں نے دارالسلام کا دورہ کیا۔اس روز مجھے ان کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم نے خاصی دیر تک نشرواشاعت کے حوالے سے گفتگو کی۔ قاضی صاحب نے دارالسلام کے ہر شعبے کو بڑی اچھی طرح دیکھا۔ کارکنان سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا اور ان سے باتیں کیں۔ ہم نے بھی ان کی آمد پر دارالسلام کو خوب سجایا تھا۔ میں نے ان کو دارالسلام کی شائع شدہ کتب اور آئندہ کے منصوبوں کے بارے میں بریف کیا۔ انھوں نے بھی خوب دلچسپی لی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں بہت تھوڑا وقت دیں گے۔ مگر یہ ان کا بڑا پن تھا کہ انھوں نے کوئی دو گھنٹے سے زائد وقت دارالسلام میں گزارا۔ میں نے ان سے مہمانوں کی کتاب میں دارالسلام کے بارے میں تاثرات لکھنے کی درخواست کی۔ انھوں نے مہمانوں کی کتاب میں مندرجہ ذیل تاثرات لکھے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''محترم مولانا عبدالمالک مجاہد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دین کی اشاعت کے جذبے سے سرشار کیا ہے۔ دنیا بھر میں دارالسلام کے ادارے کو منظم کر کے انھوں نے اس عالمی بستی کے ہر کونے تک قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی پہنچائی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: «اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا» ان کے امتیوں کے ذمے ان کی نصرت لازمی ہے اور تعلیم کے ذریعے نبی کریم ﷺ کا پیغام پہنچانا ہر امتی کا فرض ہے۔ «بَلِّغُوا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً» کے ارشاد گرامی کے مطابق دین کی اشاعت ہر امتی پر واجب ہے۔

میں ریاض میں دارالسلام کے مرکزی دفتر کے دورے کو اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں۔ دارالسلام کے تجربے سے استفادہ کر کے اسی نقشے کے مطابق علم دین کی اشاعت کے ذریعے سب لوگوں کو تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے۔

ادارہ دارالسلام نے محققین کے ذریعے سے علمی تحقیق اور تراجم کا جو سلسلہ جاری کیا ہے یہ بھی ایک مبارک کوشش ہے اور تشنگان علم دین کے لیے ایک نعمت ہے۔''

قاضی حسین احمد

دینی حلقوں میں دھرنا، ملین مارچ اور ریلیوں جیسی اصطلاحات ناپید تھیں۔ مگر قاضی صاحب نے اپنی انتہائی متحرک زندگی میں بے شمار ریلیاں نکالیں، سینکڑوں جلسے کیے، نہ جانے کتنے جلوسوں کی قیادت کی۔ ان گنت مظاہروں میں شریک ہوئے۔ قاضی صاحب کے مرکزی جمعیت اہل حدیث اور پروفیسر ساجد میر ﷾ کے ساتھ بڑے عمدہ مراسم تھے۔ سیکولر اور دین بے زار قوتوں کے مقابلے کے لیے دونوں جماعتوں میں مکمل ہم آہنگی تھی اور اس کے لیے کئی مشترکہ پروگرام کیے گئے۔ قاضی صاحب کئی مرتبہ اپنے ساتھیوں سمیت مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر 106 راوی روڈ لاہور تشریف لائے۔ متحدہ مجلس عمل میں بھی دونوں جماعتیں شریک سفر تھیں۔ مجھے بہت سے موقعوں پر محترم پروفیسر ساجد میر صاحب ﷾ کے ساتھ اس کی پالیسیوں پر تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ قاضی حسین احمد ؒ مجلس عمل کے صدر تھے۔ پروفیسر ساجد میر ﷾ نے ہمیشہ ان کی شرافت، متانت، مقصدیت اور ذہانت کی تعریف کی۔ قاضی حسین احمد ؒ کا ذہن ہر وقت سوچتا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو قوم کو نت نئے پروگرام دیتے تھے۔ کشمیر کے حوالے سے انھوں نے 5 فروری کو یوم یکجہتی کشمیر کی تجویز دی۔ اس روز پوری پاکستانی قوم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر زنجیر بناتی ہے۔ مظلوم کشمیریوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے 1990ء میں اس دن کو اہلِ کشمیر کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے طور پر منانے کی اپیل کی تھی، حکومت پاکستان نے بھی ان کی اس تجویز کو قبول کیا۔ اس وقت سے آج تک ہر سال یوم یکجہتی کشمیر منایا جاتا ہے۔ اس روز پاکستان میں عام تعطیل ہوتی ہے اور ملک بھر میں جلسوں، جلوسوں اور انسانی ہاتھوں کی



زنجیروں کا اہتمام ہوتا ہے۔

قاضی صاحب نے اسلامک فرنٹ کے نام سے ایک نیا تجربہ بھی کیا تھا۔ جو غالباً انھوں نے الجزائر کے اسلامک سالویشن فرنٹ سے لیا تھا۔اس میں انھوں نے سولوفلائٹ کے ذریعے الیکشن میں حصہ لیا جو بدقسمتی سے بری طرح ناکام ہوا۔ انھوں نے جماعت اسلامی سے استعفیٰ بھی پیش کیا مگر ارکان جماعت نے اسے قبول نہ کیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک لیڈر کا یہی وصف ہے ؎

پلٹ کر جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا

بلاشبہ جماعت اسلامی کا نظم بڑا مضبوط ہے۔ اگر کوئی اور جماعت ہوتی تو یقیناً ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی۔ مگر یہ قاضی حسین احمد صاحب کا سحر تھا کہ جماعت نے تھوڑے ہی عرصہ میں دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیا۔ اوراب تو لوگوں کو اسلامک فرنٹ بھول بھی چکا ہے۔ میرا ذکر کرنے کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ قاضی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو اجاگر کرنا ہے کہ وہ مشکل ترین حالات میں بھی کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے جماعت کو مسلسل مصروف کار رکھا۔ جماعتوں کی زندگی میں اگر کارکنان کو مصروف رکھا جائے تو وہ متحرک رہتے ہیں اور جماعت زندہ رہتی ہے۔ محترم قاضی حسین احمد صاحب میں یہ خوبیاں عام لیڈروں سے زیادہ تھیں۔

محترم پروفیسر ساجد میر صاحب جب بھی سعودیہ تشریف لاتے ہیں تو میرا زیادہ وقت ان کی رفاقت میں گزرتا ہے۔ اپنے جماعتی اور دعوتی پروگراموں کے علاوہ جس موضوع پر ہماری سیر حاصل گفتگو ہوتی ہے وہ پاکستان کے حالات اور سیاست ہے جس میں مذہبی سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کا بھی تذکرہ آتا رہتا ہے۔ ساجد میر صاحب ہمیشہ قاضی صاحب کے بارے میں رطب اللسان رہے۔ محترم قاضی صاحب کی وفات کے بعد پروفیسر ساجد میر صاحب سے فون پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا:

قاضی صاحب بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے۔چند ایک تو اُن کی شخصیت کا جزو لاینفک بن گئی تھیں۔ انھوں نے ساری زندگی اصول پسندی کو نہیں چھوڑا۔ ان کے سامنے بڑے واضح مقاصد تھے۔انھیں اپنے مقصد کے ساتھ بڑی لگن تھی۔

ان کا ماٹو تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ مسلمان کی زندگی وقف کر دی۔ ان کے سامنے مشن تھا۔ ان کی سوچ کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ ان کی سوچ محدود نہیں بلکہ آفاقی تھی۔ وہ صرف پاکستان کے لیے نہیں بلکہ پاکستان سے باہر نکل کر کشمیر، افغانستان، فلسطین اور دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے بارے میں سوچتے اور ان کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔

ان کا دل دنیا کے تمام مظلوم مسلمانوں کے لیے دھڑکتا تھا۔ انھوں نے پوری دنیا کے دورے کیے۔ وہاں کی اسلامی تحریکوں سے تعلقات بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام میں ایک بڑا طبقہ ان کا احترام کرتا تھا۔

محترم قارئین! قاضی صاحب کی وہ تصویر مجھے کبھی نہیں بھولی جس میں ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اسلام آباد میں ایک مظاہرے کے دوران ان پر اور ان کے رفقاء پر لاٹھی چارج کیا گیا۔ نہ جانے ان پر کتنے مصائب آئے، انھیں کس قدر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے پاکستان اور امت مسلمہ کی سربلندی کے لیے ان آزمائشوں کا مقابلہ کیا۔

قاضی حسین احمد صاحب اب اپنے اللہ کے پاس چلے گئے ہیں مگر وہ مشن جس کے لیے انھوں نے پوری زندگی گزار دی اس مشن، جذبے، سوچ اور فکر کو ہمیشہ زندہ رہنا چاہیے۔

قاضی صاحب منصب کے خواہش مند لوگوں میں سے نہیں تھے بلکہ منصب ان کے پیچھے بھاگتے تھے۔ جماعت اسلامی کی قیادت اور امارت انھوں نے 2009ء میں از خود چھوڑی ہے، حالانکہ جماعت کے بہت سے ارکان کی خواہش تھی کہ وہ اس منصب پر کام کرتے رہیں۔ ان کے دل کے دو بائی پاس ہوئے۔ اس کے باوجود ان کے کام، ان کے سفر اور ان کے پروگراموں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اپریل 2009ء سے جناب سید منور حسن حفظہ اللہ نے جماعت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ قاضی صاحب جماعتی ذمہ داریوں سے آزاد ضرور ہوئے لیکن امت مسلمہ کے درد میں بے چین اس روح کو کہاں قرار آنے والا تھا۔ ان کی سرگرمیاں جاری رہیں، کبھی وہ اتحاد امت کے لیے سیمینارز کرواتے اور کبھی پاکستان کے بارے میں درد رکھنے والے دفاعی ماہرین اور



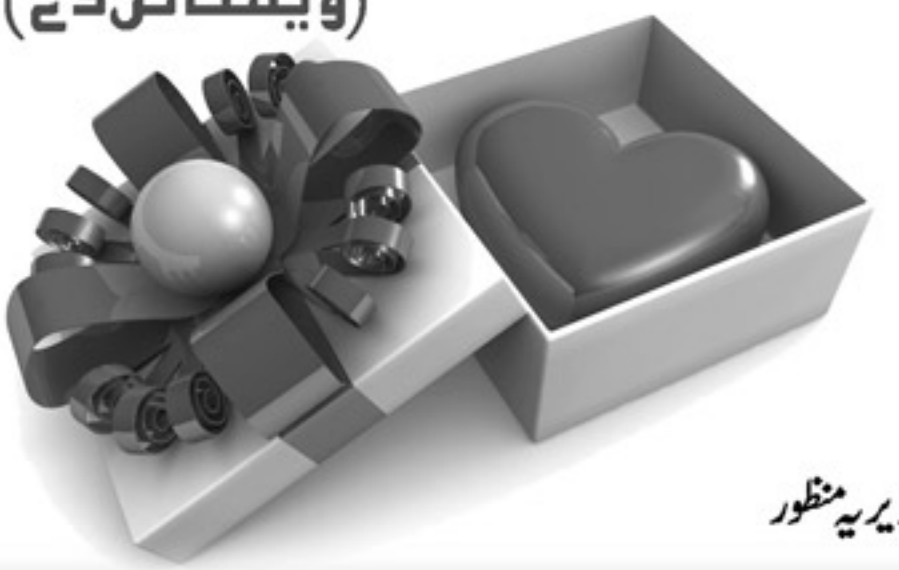
دانشوروں کے تھنک ٹینک بناتے نظر آتے۔ آخری وقت تک ان کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو شرف قبولیت بخشے اور ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

میری بڑی خواہش تھی کہ میں ان کی وفات پر منصورہ جا کر تعزیت کروں، چنانچہ عزیزم طلحہ مجاہد اور قاسم علوی کے ساتھ منصورہ گیا۔ محترم عبدالوکیل علوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ میرے عزیز بھی ہیں۔ میں تعزیت کے لیے بغیر کسی پیشگی اطلاع کے گیا تھا۔ اس روز جماعت کی شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا اور تمام اہم ذمہ داران اجلاس میں شریک تھے۔ اس لیے محترم گوندل صاحب اور دیگر احباب کے ساتھ قاضی صاحب کی تعزیت کی۔ ان کے اہل خانہ ابھی تک نوشہرہ ہی میں تھے۔ مجھے عزیزم قاسم علوی نے ان کی بیٹی کا گھر دکھایا اور بتایا کہ قاضی صاحب اس گھر میں قیام کرتے تھے۔

میں مضمون کا اختتام محترم قاضی صاحب کے اس خط کے شکریہ کے ساتھ کروں گا جو انھوں نے میرے بارے میں سعودی حکومت کو لکھا تھا۔ میں نے متعدد بار فون پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے سیکرٹری جناب عبدالغفار صاحب سے رابطہ رہتا۔ رمضان المبارک اور عیدین کے موقع پر ان سے سلام ہو جاتا اور ان کی خیریت دریافت کر لیتا اور ان کو تہنیت کے پیغام بھی بھجواتا۔

عالمی یومِ محبت اور مسلمان

(ویلنٹائن ڈے)



جویریہ منظور

''ویلنٹائن ڈے'' کو عالمی یومِ محبت کہا جاتا ہے۔ اس دن کی تاریخ کے حوالے سے مختلف اقوال ہیں۔ ان اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ ''ویلنٹائن ڈے'' ایک رومی عید ہے جس کی ابتدا تقریباً 1700ء میں ہوئی تھی۔ اسی مناسبت سے ہر سال 14 فروری کو شادی شدہ اور غیر شادی شدہ جوڑے یہ عید مناتے ہیں۔

اس عید میں کیا ہوتا ہے؟

- اس عید میں ایسی ایسی خوشیوں کا اظہار ہوتا ہے کہ گویا یہ کوئی شرعی اور مسلمانوں کی خاص عید ہو۔
- نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کو کارڈز، چاکلیٹ اور دل کی شکل کے غبارے وغیرہ پیش کر کے اپنی محبت اور عشق کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ تو صرف چند امور ہیں جو ہمیں بظاہر نظر آتے ہیں۔ اس کی آڑ میں نجانے کتنی لڑکیاں اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

گزشتہ دو تین سالوں میں میڈیا نے اِسے اس قدر بڑھا چڑھا دیا ہے کہ اس دن کی مخالفت کرنے والا دقیانوس تصور کیا جاتا ہے۔ آخر مغربی تہذیب وتہوار ہم پر کیوں فرضِ عین کی طرح تھوپے جا رہے ہیں؟؟ اور کیوں اس دن کو جائز ثابت کرنے کے لیے مختلف حیلے اور بہانے تراشے جاتے ہیں۔ ہم آنے والی نسلوں کو کیا پیغام دینا چاہ رہے ہیں۔ کیوں اپنے ہی ہاتھوں اپنی نوجوان نسل کا بیڑا غرق کر رہے ہیں؟؟؟

روشن خیال اور پڑھے لکھے افراد کے بقول یہ عالمگیریت (Globalization) کا دور ہے۔ جس بنا پر ہمیں دوسرے مذاہب کے تہواروں میں بھی شامل ہونا چاہیے۔

روشن خیال طبقے کا موقف یہ ہے کہ اس دن



کو منانے سے منع کرنے والے تو محبت کے دشمن ہیں، وہ تو لوگوں کو خوشیوں سے محروم کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ ارے ظالمو! اتنا تو بتا دو کہ کیا ہمارے نبی نے یہودیوں یا عیسائیوں کے تہوار منائے یا ان میں شامل ہونے کا درس دیا؟؟

جبکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انھی میں سے ہے۔'' (مسند احمد: 50/2)

دینِ اسلام تو امن و محبت کا دین ہے۔ اسلام جس قدر انسانی جذبات کی قدر کرتا ہے اتنا کوئی اور مذہب نہیں کرتا۔ محبت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔

کیا ایک دن اپنے پیاروں سے محبت کا اظہار کرنے سے محبت کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں؟؟ خاص کر جب اس کے لیے کوئی خاص دن مخصوص کیا جائے۔ ایسے دنوں کی مسلمانوں کو کیا ضرورت ہے، پھر یہ کہ اظہارِ محبت سال کے بارہ ماہ کیوں نہیں صرف ایک دن ہی کیوں؟ اللہ کے بندو! ہمارا دین تو 1400 سال پہلے ہی مکمل ہو چکا ہے۔ دین اسلام ایک مکمل دین ہے۔ اب اس میں کسی بھی قسم کے اضافے کی گنجائش نہیں۔

بعض لوگ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ یہ دن غیر شادی شدہ جوڑے ہی منائیں بلکہ میاں بیوی، بہن بھائی یا گھر کے تمام افراد بھی مل کر یہ دن منا سکتے ہیں۔ ان سے سوال ہے کہ جس دن کی تاریخ ہی اتنی گندی ہو بھلا ایسا دن ہم اپنے بچوں کو منانے کی کیسے اجازت دے سکتے ہیں؟؟ اور ویلنٹائن ڈے کے نام پر بے حیائی کو کیسے فروغ دے سکتے ہیں؟ جبکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''حیا ایمان سے ہے۔ جس میں حیا نہیں اُس کا جو جی چاہے کرے۔''

(صحیح مسلم: 36، مسند أحمد: 121/4)

یقیناً جو لوگ ایسے تہواروں کے حمایتی ہیں وہ قرآن و سنت کے احکام سے نا واقف ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کے آرزومند رہتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔''

(النور 19:24)

رب العالمین ایک اور جگہ فرماتا ہے:

'' کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جو اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے۔ کیا آپ اس کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔''

(الفرقان 43:25)

اور فرمایا: ''پھر اگر یہ آپ کی بات نہ مانیں تو آپ یقین کر لیں کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہے جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہو۔''

(القصص 50:28)

ہر سال 14 فروری سے پہلے ہی میڈیا پر ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے اشتہاری مہم شروع ہو جاتی ہے۔ گویا اس بے ہودہ تہوار ''ویلنٹائن ڈے'' کو زبردستی ہمارے گھروں میں داخل کیا جا رہا ہے۔ جو اس دن کو منانے کے قائل ہیں ان میں سے ایک طبقہ تو یہ کہتا ہے کہ ہمارے پاس خوشی کے مواقع بہت کم ہیں۔ آج کل ہر جگہ بدامنی اور ڈپریشن ہے، لہٰذا اس میں کیا قباحت ہے اگر محبت کرنے والے اس دن اپنے چاہنے والوں کو محبت کا پیغام دیں اور اگر یہ سب ایک حد میں رہ کر کیا جائے تو بھی اس کو اتنا ایشو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خودساختہ حد کا تعین کون کرے گا کیونکہ ہر انسان کی نظر میں حد مختلف ہو گی جبکہ ہمارے دین میں ہر قسم کی حدود و قیود کا تعین کر دیا گیا ہے۔

ویلنٹائن ڈے کو ثقافت کا لیبل لگا کر اس کی خوب حمایت و تشہیر کی جاتی ہے اور عوام الناس کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ مذہب و ثقافت دو الگ الگ چیزیں ہیں، ان کو خلط ملط نہ کیا جائے۔

اللہ کے بندو! ہوش کے ناخن لو، بھلا یہ بتاؤ کہ کیا ہماری ثقافت ہماری شریعت و دین سے عظیم ہے کہ ہم دوسری اقوام کے تہواروں کو ثقافت کا غلاف چڑھا کر اپنا لیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ ہو جائیں۔''

(البقرۃ 120:2)

بہرحال برائی برائی ہوتی ہے۔ چاہے اس پر اچھائی کے کتنے ہی غلاف چڑھا لیے جائیں یا اس کو کتنا ہی خوشنما بنا کر پیش کیا جائے۔ جہاں سوال ہمارے دین کا ہو اور جہاں کھلم کھلا دین کا مذاق اڑایا جا رہا ہو۔ ایسے میں خاموش نہیں رہا جا سکتا اور نہ اس پر سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے۔



عراق کے مختلف نام

آج کا عراق ماضی میں کئی ناموں سے مشہور تھا، مثلاً:

① سورستان: یہ عراق کا پہلا ایرانی نام تھا۔

② دلِ ایران شہر: قدیم ایرانی بادشاہوں کے عہد میں عراق ''دلِ ایران شہر'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نام کو مختصر کر کے عربوں نے ایران سے عراق بنا لیا۔

③ میسو پوٹیمیا: یونانی عراق کو میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) کہتے تھے جس کے معنی ہیں ''دو دریاؤں کے درمیان کی سرزمین'' کیونکہ اس میں دجلہ اور فرات دو بڑے دریا بہتے ہیں۔ اسی لیے عرب اس کو مابین النھرین، بلاد الرافدین (دو دھاروں کی سرزمین) یا الجزیرہ کہتے تھے۔

الجزیرہ اور عراق

اس علاقے کو الجزیرہ اس لیے کہا گیا کہ ترکی میں دریائے دجلہ دریائے فرات کے بڑے دھارے کے قریب سے نکلتا ہے اور جنوب مشرق کو بہتا ہے جبکہ فرات جنوب کو بہتا ہوا شام میں داخل ہوتا ہے، پھر مشرق اور جنوب مشرق کا رخ اختیار کر کے عراق میں آتا ہے حتی کہ القرنہ کے مقام پر دونوں دریا باہم مل جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کے درمیان ایک بڑا جزیرہ سا بن جاتا ہے۔ ان دنوں الجزیرہ کا شمالی حصہ ترکی میں، مغربی حصہ شام میں اور بڑا جنوب مشرقی حصہ عراق میں شامل ہے۔

لغت میں عراق مشکیزے کے نچلے حصے کو کہتے ہیں، اس حوالے سے اس ملک کا نام عراق رکھا گیا کیونکہ وہ سرزمین عرب کا سب سے نچلا یا نشیبی حصہ ہے۔

ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ ''اس ملک کا نام عراق اس لیے رکھا گیا کہ یہ نجد سے نیچے اور



سمندر کے قریب ہے'' جبکہ الخلیل کے بقول ''عراق سمندر کے کنارے کو کہتے ہیں اور عراق کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ وہ دجلہ اور فرات کے کناروں پر سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔'' ماضی میں کوفہ اور بصرہ کو العراقان (دو عراق) کہا جاتا ہے۔ (معجم البلدان)

عراق ایک نظر میں

✿ دارالحکومت: بغداد ✿ سرکاری زبانیں: عربی اور کردی ✿ طرزِ حکومت: پارلیمانی جمہوری حکومت ✿ یومِ آزادی: 3 اکتوبر 1932ء ✿ بادشاہت کا خاتمہ: 14 جولائی 1958ء ✿ رقبہ: 438317 مربع کلومیٹر ✿ آبادی: 31,234000 (تخمینہ 2009ء) ✿ سکہ / کرنسی: عراقی دینار، (ایک ڈالر = 1163 عراقی دینار) ✿ مذہب: اسلام ✿ صنعتی پیداوار: کیمیکلز، پارچہ بافی، سیمنٹ، چمڑے کی مصنوعات، شکر سازی، ✿ زرعی پیداوار: گندم، جو، چاول، کھجوریں، کپاس۔ کھجوروں کی پیداوار میں عراق دنیا میں سرِ فہرست ہے۔ ✿ پرچم: یہ سرخ، سفید اور سیاہ پٹیوں پر مشتمل ہے۔ سفید حصے میں اللہ اکبر لکھا ہوا ہے۔

عراقی تیل کی صنعت

عراق میں دنیا کے دوسرے بڑے معدنی تیل کے ذخائر ہیں جن کی مقدار 143.4 ارب بیرل ہے۔ یہ روزانہ 30 لاکھ بیرل تیل پیدا کرتا ہے جس میں 17 لاکھ بیرل برآمد کر دیا جاتا ہے۔ 95 فی صد آمدنی معدنی تیل کی برآمد سے حاصل ہوتی ہے۔ کرکوک تیل کی صنعت کا مرکز ہے۔

عراق کہاں واقع ہے؟

عراق کے شمال میں ترکی، جنوب میں خلیج فارس اور کویت، مشرق میں ایران، شمال مغرب میں شام اور مغرب میں اُردن جبکہ جنوب مغرب میں سعودی عرب واقع ہے۔ ترکی سے آنے والے دریا، دجلہ اور فرات جنوبی عراق میں ملتے ہیں تو شط العرب بنتا ہے۔ بصرہ کے جنوب میں ایران سے آنے والا دریائے کارون بھی شط العرب سے آن ملتا ہے جو آخر کار خلیج فارس میں آ گرتا ہے جسے عرب ممالک خلیج عربی کہنا پسند کرتے ہیں۔ عراق کا مغربی علاقہ صحرائے شام کا حصہ ہے۔ یہ عظیم صحرا شام، اردن، عراق اور سعودی عرب میں پھیلا ہوا ہے۔ عراق کا دارالحکومت بغداد دریائے دجلہ کے کنارے واقع ہے۔

عراق کے مشہور شہر

موصل، اربیل، کرکوک، سلیمانیہ، سامراء، بغداد، الکوت، سلمان پاک، ناصریہ، قردہ، الزبیر، بصرہ، کویت، نجف، کربلا، رمادی۔

طوفانِ نوح عراق میں

عراق بہت قدیم تہذیب کا وارث ہے۔ کوئی سات ہزار سال پہلے کوفہ کے آس پاس کے علاقے میں آباد قوم بتوں کی پوجا کرتی تھی جن کے نام قرآن میں یوں آئے ہیں: وَد، سُواع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال اس قوم میں تبلیغ کی مگر وہ بت پرستی سے باز نہ آئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس سرکش قوم کو ایک تباہ کن سیلاب میں غرق کر دیا۔ صرف چالیس مومنوں کا گروہ نوح علیہ السلام کے ساتھ ایک بڑی کشتی میں محفوظ رہا۔ آپ کا نافرمان بیٹا کنعان بھی سیلاب میں غرق ہو گیا۔ آخر کار اُن کی کشتی جُودی پہاڑ پر اُتری جو ترکی اور آرمینیا کی سرحد پر واقع ہے اور اسے ارارات بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے چلا۔

سمیری قوم کی ہنرمندی

یہ قوم تقریباً 4000 ق م میں جنوبی عراق میں آباد تھی۔ سمیریوں نے وقت کے پیمانے، یعنی دن کے چوبیس گھنٹے، گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور منٹ کے ساٹھ سیکنڈ مقرر کیے۔ انھوں نے تصویری اور میخی (Cuneiform) رسم الخط ایجاد کیے۔ گنتی میں درجن کا استعمال بھی سمیریوں کا کام ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حمورابی اور نمرود

1800 ق م کے لگ بھگ عراق پر حمورابی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس نے قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جسے دنیا کا پہلا آئین کہا جاتا ہے۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ حمورابی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ لیکن قرآن میں ابراہیم علیہ السلام سے جس بادشاہ کے مکالمے کا ذکر ہے اس کا نام مورخین نے نمرود بیان کیا ہے۔ آپ وسطی عراق کے شہر کوثیٰ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں بت خانے کے بُت توڑنے کے جرم میں انھیں آگ میں ڈالا گیا لیکن اللہ کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ پھر ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ سارہ اور بھتیجے لوط علیہ السلام کے ہمراہ ہجرت کر کے اُور، بابل اور حاران



(ترکی) سے ہوتے ہوئے فلسطین چلے آئے۔

یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں

شمالی عراق کے شہر موصل کے قریب قدیم اشوری سلطنت کے دارالحکومت نینویٰ کے کھنڈر واقع ہیں۔ نینویٰ والوں کی ہدایت کے لیے حضرت یونس علیہ السلام (860 ق م تا 784 ق م) بھیجے گئے مگر قوم نے توحید کی بات نہ مانی تو آپ ناراض ہو کر وہاں سے چلے آئے اور کشتی پر سوار ہوئے۔ کشتی سمندر (بحیرۂ روم) میں ڈوبنے لگی تو کسی نے کہا کہ کوئی شخص اپنے آقا سے بھاگا ہوا اس میں سوار ہے، اسے سمندر میں پھینک دو۔ قرعہ ڈالا گیا تو وہ تین بار یونس علیہ السلام کے نام نکلا، چنانچہ آپ نے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور ایک بڑی مچھلی (غالباً وہیل) نے آپ کو نگل لیا۔ مچھلی کے پیٹ میں آپ نے دعا کی تو اس نے آپ کو سمندر کے کنارے اُگل دیا۔ آپ تندرست ہو کر دوبارہ اپنی قوم کے پاس گئے تو وہ عذاب کے آثار دیکھ کر توبہ کر چکی تھی۔ یہ دنیا کی واحد قوم تھی جس کے توبہ کرنے سے عذاب ٹل گیا۔

بابل کے معلق باغات

چھٹی صدی قبل مسیح میں عراق کے شہر بابل میں بخت نصر نے ایک بہت بڑی سلطنت قائم کی۔ جسے کلدانی سلطنت کہا جاتا ہے۔ اس نے 586 ق م میں بیت المقدس فتح کیا، ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا اور ایک لاکھ یہودیوں کو گرفتار کر کے عراق لے آیا۔ بخت نصر نے بابل میں معلق باغات لگوائے۔ ایک اونچے بہت بڑے ٹیلے کے اردگرد اس طرح سیڑھی دار باغات لگائے گئے کہ وہ دور سے ہوا میں معلق نظر آتے تھے۔ بابل کے معلق باغات دنیا کے قدیم عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔ بابل ہی میں 323 ق م میں دنیا کے فاتح اسکندر اعظم نے وفات پائی۔ بخت نصر نے عرب پر بھی حملہ کیا تھا اور واپسی پر معد بن عدنان کو ساتھ لے گیا جو نبی کریم ﷺ کے جدِّ امجد تھے۔

ذوالقرنین اور سکندر اعظم عراق میں

ایران کے بادشاہ کوروش کبیر (Cyrus the Great) نے 539 ق م میں بابل عراق فتح کر کے کلدانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اسے یونانیوں نے سائرس کا نام دیا جبکہ جدید مسلم محققین کے مطابق کوروش ہی کو قرآن میں ذوالقرنین کہا گیا کیونکہ اس کے تاج پر دو سینگوں والے مینڈھے کا نقش تھا۔ عربی میں قرن کے معنی ہیں سینگ، لہٰذا وہ ذوالقرنین کہلایا۔ کوروش کی ہخامنشی سلطنت مصر سے لے کر ماوراء النہر اور دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اللہ کا مومن اور نیک بندہ تھا۔ اس نے یہودیوں کو رہائی دی اور انھوں نے واپس یروشلم (بیت المقدس) جا کر دوسرا ہیکل سلیمانی تعمیر کیا۔

330 ق م میں سکندرِ اعظم نے بابل فتح کر کے ہخامنشی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس نے اپنی فتوحات کو دریائے بیاس اور سندھ تک پھیلا دیا۔ واپسی پر سکندرِ اعظم 323 ق م میں بابل میں فوت ہو گیا جسے وہ اپنی سلطنت کا دارالحکومت بنانا چاہتا تھا۔ اس کے جرنیل سلیوکس نے مشرقی یونانی سلطنت کا دارالحکومت سلیوکیہ کو بنایا جو دریائے دجلہ کے کنارے آباد کیا تھا۔ یہیں بعد میں طاق کسریٰ بنا۔ ظہور اسلام کے وقت اس کا نام مدائن تھا۔

عراق ساسانی حکومت میں

226ء میں اردشیر اول نے ایران میں ساسانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے جانشین شاپور اول نے عراق و شام فتح کر کے سلطنت کو بحیرہ روم تک وسعت دی۔ ساسانیوں کا پہلا دارالحکومت اصطخر نزد شیراز تھا۔ پھر انھوں نے مدائن (Ctesiphon) کو دارالسلطنت بنایا۔ خسرو اول یا نو شیرواں (531-79ء) ساسانیوں کا مشہور ترین بادشاہ تھا۔ اس کا نام خسرو (کسریٰ) بعد کے بادشاہوں کا لقب ٹھہرا۔ رسول اللہ ﷺ نوشیرواں کے عہد میں پیدا ہوئے جس کا عدل مشہور تھا۔ اس کے جانشین ہرمز چہارم اور خسرو پرویز (خسروثانی) ہوئے۔ 6ھ / 628ء میں نبی ﷺ کا دعوتی خط مدائن پہنچا تو خسرو پرویز نے غصے میں اسے چاک کر دیا تھا، پھر تھوڑے دنوں بعد وہ اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا اور پھر عہدِ فاروقی میں ساسانی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور عراق و ایران اسلامی سلطنت میں شامل ہو گئے۔

نوشیرواں عادل کا بے مثال "عدل"

خسرو اول یا نوشیرواں (531-79ء) کا عدل مشہور ہے۔ اس کے عہد میں نبی ﷺ کی ولادت ہوئی۔ نوشیرواں نے رومی قیصر جسٹینین کے لشکروں کو شکست دے کر سارا شام پامال کر



ڈالا اور نئے قیصر جسٹن ثانی نے (73-565ء) تاوان دے کر صلح کی۔ نوشیرواں کا وزیر بزرگ مہر (بزرجمہر) بہت اچھا منتظم تھا۔ اس کے ظالمانہ ''عدل'' کی ایک مثال عبرتناک ہے۔ اس کی ایک مجلسِ مشاورت میں دبیرِ خراج نے لگان کی نئی شرحیں بآواز بلند پڑھ کر سنائیں۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اعتراض کیا تو نوشیرواں نے گرج کر کہا: ''اے مردِ ملعون! تو کون ہے؟'' اس نے کہا: ''میں دبیر (منشی) ہوں۔'' بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے قلمدانوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالو۔ اس پر دوسرے دبیروں نے اسے قلمدان مار مار کر سنگسار کر دیا۔ اس کے بعد سب حاضرین نے کہا: ''عالی جاہ! جتنے ٹیکس آپ نے لگائے ہیں، وہ سب انصاف پر مبنی ہیں۔''

عراق اسلام کے پرچم تلے

طلوعِ اسلام کے وقت ایران پر ساسانی ایرانی بادشاہوں کی حکومت تھی۔ ان کا دارالحکومت مدائن دجلہ کے دونوں کناروں پر واقع تھا۔ دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں جنگِ قادسیہ (15ھ/636ء) میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایرانی سپہ سالار رستم کو شکستِ فاش دی۔ رستم میدان جنگ میں مارا گیا۔ پھر ساسانی دارالحکومت مدائن فتح ہو گیا اور آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد شاہ سوم شکست کھا کر پہلے ایران اور پھر خراسان کی طرف نکل گیا جہاں وہ خلافتِ عثمانی میں مرو رود کے پاس غربت میں مارا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر عراق میں کوفہ اور بصرہ کے شہر بسائے گئے۔

جنگِ قادسیہ میں ہندوستان کے ہاتھی

جنگ قادسیہ (15ھ / 636ء) میں ایرانی سپہ سالار رستم کے لشکر میں 30 جنگی ہاتھی شامل تھے۔ وہ گویا اس زمانے کے ٹینک تھے جن کے اوپر عماریوں میں محفوظ بیٹھے ایرانی مسلمانوں پر تیر برساتے تھے۔ اسلامی لشکر کے ایک سالار قعقاع بن عمرو تمیمی رضی اللہ عنہ نے اس کا توڑ یہ نکالا کہ اونٹوں کے سروں پر سیاہ جھول چڑھا کر انھیں ہاتھیوں کی طرف بڑھایا تو وہ ڈر کر پیچھے کو بھاگے اور ایرانی فوج کو کچلتے چلے گئے۔ یوں اس چار روزہ جنگ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمانوں کو شان دار فتح حاصل ہوئی اور رستم مارا گیا۔

درفش کاویانی: ایک عجوبہ

قدیم ایران کے ظالم بادشاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والے کاوہ لوہار کے نام پر بننے والا ایرانی پرچم درفش کاویانی کہلاتا تھا۔ فتح قادسیہ کے موقع پر یہ پرچم مسلمانوں کے ہاتھ لگا جسے جنگوں میں لہرایا جاتا تھا۔ ہر فتح کے بعد اس پر جواہر نچھاور کیے جاتے۔ اسے سونے چاندی، جواہر اور موتیوں سے سجا دیا جاتا تھا۔ اس پر ایک طلسم نقش تھا اور پانچ مجوسی پروہت (موبدان) اسے اٹھائے لشکر کے آگے آگے چلتے۔ درفش کاویانی پر سورج کی بنفشئ رنگ کی شبیہ تھی جس کے اوپر سنہری بدر نمایاں تھا۔ اس پرچم کے ساتھ قصر مدائن سے حاصل ہونے والے عجائب کسریٰ میں خسرو پرویز کی ملکہ شیریں، کسریٰ کا سیاہ گھوڑا شبدیز، اس کا سفید ہاتھی اور ''بہار'' نامی کسریٰ کا فرش شامل تھا۔ نوے گز لمبے اور دس گز چوڑے اس فرش پر پھول پتیاں، درخت، نہریں، تصویریں اور غنچے سب سونے چاندی اور جواہرات سے بنائے گئے تھے اور موسمِ بہار گزرنے پر بادشاہ اور اعیانِ حکومت اس پر بیٹھ کر شراب پیتے تھے۔ علاوہ ازیں قصر مدائن سے کسریٰ کے سنہری کنگن ملے جن کے بارے میں اثنائے ہجرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ بن جعشم کو بشارت دی تھی کہ وہ انھیں پہنے گا۔

کوفہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دارالخلافہ

دریائے فرات کے مغربی کنارے پر واقع یہ شہر اوائل اسلام میں بصرہ کی طرح علم و فضل کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک چھاؤنی کے طور پر بسایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یہیں جامع مسجد میں 40ھ میں عبدالرحمٰن ابن ملجم نے انھیں شہید کر دیا۔ ان کو کوفہ کے نزدیک نجف میں دفن کیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں درس دیتے رہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور عبداللہ بن مبارک کوفہ میں پیدا ہوئے۔ عربی کا ایک مشہور رسم الخط کوفی رسم الخط کہلاتا ہے۔

کربلا: نواسۂ رسول کا مدفن

10 محرم 61ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما 72 جاں نثاروں کے ساتھ میدان کربلا میں لشکرِ یزید سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے، چنانچہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ، ان کے بھائی عباس اور صاحبزادے علی اکبر یہیں



دفن ہوئے۔ شہداء میں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے بیٹے قاسم بھی تھے۔ اس وقت دریائے فرات کی شاخ کربلا کے قریب ہی بہتی ہو گی مگر ان دنوں وہ کربلا سے خاصا دور ہے۔

''شہرِ امن'' بغداد

دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے دریائے دجلہ کے کنارے سوق بغداد نامی بستی کو دارالخلافہ کے طور پر پسند کیا، چنانچہ یہاں تعمیرات شروع ہوئیں اور 46ھ / 761ء میں دارالخلافہ بغداد کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ منصور نے اسے مدینۃ السلام یعنی ''شہرِ امن،، کا نام دیا جو اگلی پانچ صدیوں تک خلافتِ عباسیہ کا مرکز بنا رہا۔ بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی، امام ابوحنیفہ، معروف کرخی، سری سقطی، جنید بغدادی، موسیٰ کاظم اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ مدفون ہیں۔

ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی

656ھ / 1258ء میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے بغداد تباہ کر دیا اور اٹھارہ لاکھ کے قریب مسلمان شہید کر دیے جن میں عباسی خلیفہ مستعصم باللہ بھی شامل تھے۔ ہلاکو نے یہ حملہ بغداد کے شیعہ وزیر اعظم موعید الدین علقمی کی دعوت پر کیا تھا۔ تاتاریوں نے بغداد پر قبضے کے بعد یہاں کی لائبریریوں کی لاکھوں کتابیں دجلہ میں پھینک دیں اور ان کی روشنائی سے دریائے دجلہ کا پانی کئی دن تک سیاہ نظر آتا رہا۔ اس تباہی کا بڑا سبب مسلمانوں کے باہمی فرقہ وارانہ اختلافات تھے۔ ان دنوں بغداد کی آبادی 72 لاکھ سے زائد ہے۔

المامون اور امام علی رضا

عباسی خاندان کا ساتواں خلیفہ مامون الرشید (198ھ / 813ء تا 218ھ / 833ء) ہارون الرشید کی ایرانی کنیز مراجل کے بطن سے تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی امین الرشید کے ساتھ پانچ سالہ کشمکش کے بعد تخت نشین ہوا لیکن وہ دارالخلافہ بغداد میں چھ سال سے پہلے داخل نہ ہو سکا اور مرو میں مقیم رہا۔ 199ھ میں اس کے خلاف محمد بن ابراہیم علوی (ابن طبا طبا) نے بغاوت کی، تاہم جلد ہی ابن طبا طبا کا انتقال ہو گیا۔ رمضان 201ھ میں المامون نے امام علی الرضا کو ولی عہد نامزد کیا اور عباسیوں کا سیاہ رنگ چھوڑ کر علویوں کا سبز رنگ اختیار کر لیا۔ اس پر بغداد کے باشندوں نے المامون کے چچا ابراہیم کو خلیفہ منتخب کر لیا (ذوالحجہ 201ھ)، چنانچہ المامون مجبوراً 202ھ میں مرو کو خیر باد کہہ کر عراق پہنچا۔ دریں اثنا امام علی الرضا اچانک وفات پا گئے اور بغداد میں عربوں کے مخالف وزیر فضل بن سہل کو قتل کر ڈالا گیا تو اہلِ بغداد نے ابراہیم کی مزید حفاظت و حمایت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ پھر 204ھ میں المامون بغداد میں داخل ہوا اور اس نے سبز رنگ کے بجائے پھر سیاہ رنگ اختیار کر لیا۔ یوں خلافت عباسیوں سے علویوں کو منتقل ہوتے ہوتے رہ گئی۔ المامون کے عہد میں بحیرۂ روم کے جزیرے سسلی (صقلیہ) اور کریٹ (اقریطش) فتح ہوئے۔

الجبرا بغداد میں ایجاد ہوا

خلیفہ مامون الرشید کے ایماء پر محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے افلاک اور کرۂ ارض کے نقشوں کی ایک اٹلس صورۃ الارض مرتب کی۔ وہ ان ماہرین فلکیات میں بھی شامل تھا جس نے زمین کے درجات کی پیمائش کی اور طول بلد کے ایک درجے کی اوسط لمبائی 56.666 عربی میل قرار پائی۔ جس سے زمین کا محیط معلوم کیا گیا۔ علاوہ ازیں الصورۃ المامونیہ کے نام سے دنیا کا ایک نقشہ تیار کیا گیا جو بطلیموس کے نقشے سے بہتر تھا۔ ریاضی میں الخوارزمی کی اہم ترین تصنیف ''حساب الجبر والمقابلہ'' بنی جو موجودہ الجبرا کی بنیاد ہے۔

الخوارزمی کے پاس ایک دیہاتی آیا اور اس نے ایک پہیلی یوں پیش کی: ''میرے پاس چند اشرفیاں تھیں۔ میں نے ان میں اصل تعداد کا دس گنا اور اشرفیاں ملا دیں تو کل 39 ہو گئیں۔ بتائیں میرے پاس شروع میں کتنی اشرفیاں تھیں؟'' الخوارزمی اس کا فوری جواب نہ دے سکا کیونکہ کسی مروجہ حسابی طریقے سے اس کا حل نہیں نکلا۔ آخر کار اس نے نا معلوم مقدار (لا) کی قیمت تکمیل مربع سے 3 اشرفیاں نکال لی، پھر اسے مساوات کی شکل دی جسے آج $x^2+10x=39$ یا $y^2+10y=39$ یعنی دو درجی مساوات کی شکل میں لکھا جاتا ہے۔

کوفہ میں حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما میں صلح

رمضان 40ھ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جامع مسجد کوفہ میں سیدنا



حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی۔ چار ماہ بعد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ لشکرِ عراق کے ہمراہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ لشکرِ شام کے ہمراہ مسکن (نزد انبار، عراق) کے مقام پر آمنے سامنے ہوئے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کا خون بہانے سے گریز کرتے ہوئے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو صلح کی پیشکش کی جو انھوں نے قبول کر لی۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی شرطیں مان کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے ہمراہ کوفہ میں داخل ہوئے، صلح نامہ تحریر ہوا اور جمادی الاولیٰ 41ھ میں جامع مسجد میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی عام بیعت ہوئی۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق پیش گوئی پوری ہوئی کہ میرا یہ بیٹا مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔

عراق کے مشہور مقامات

واسط

یہ شہر حجاج بن یوسف گورنر عراق نے خلیفہ ولید (15-705ء) کے عہد میں بصرہ، کوفہ اور اہواز تینوں کے وسط میں آباد کیا تھا، اس لیے یہ واسط کہلایا۔ یہیں سے حجاج نے محمد بن قاسم کو فتح سندھ کے لیے بھیجا تھا۔ حجاج کی وفات پر نئے خلیفہ سلیمان نے فاتح سندھ محمد بن قاسم کو واپس بلا لیا اور پھر اس مایۂ ناز سپہ سالار نے واسط کے قید خانے میں وفات پائی۔ وہ حجاج بن یوسف کے چچا زاد بھائی قاسم کے بیٹے تھے۔ واسط صدیوں پہلے کھنڈر بن گیا تھا۔

صلاح الدین

یہ عراق کا وسطی صوبہ ہے۔ دریائے دجلہ اس میں سے گزرتا ہے۔ صلیبی جنگوں کے فاتح سلطان صلاح الدین ایوبی اس صوبے کے دارالحکومت تکریت میں پیدا ہوئے تھے۔ سابق صدر صدام حسین کا تعلق بھی تکریت کی ایک نواحی بستی سے تھا۔

بصرہ

یہ شہر شط العرب کے مغربی کنارے واقع ہے اور عراق کی مشہور بندرگاہ ہے۔ اسلامی تاریخ میں بصرہ علم و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ حضرت حسن بصری محدث یہیں کے رہنے والے تھے۔ بصرہ کے ارد گرد کھجوروں کے باغات کثرت سے ہیں۔ بصرہ کی کھجور دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس شہر کی آبادی تقریباً 20 لاکھ ہے۔

سامراء

دریائے دجلہ کے کنارے واقع یہ شہر عباسی خلیفہ معتصم باللہ نے بطور دارالخلافہ آباد کیا تھا اور اس کی خوبصورتی کے باعث اس کا نام سُرَّ مَنْ رَأَی پڑ گیا جس کے معنی ہیں: ''جس نے دیکھا، خوش ہوا۔'' یہ نام بگڑتے بگڑتے سامراء بن گیا۔ سامراء 836ء سے 892ء تک عباسی خلافت کا دارالحکومت رہا حتی کہ خلیفہ معتمد علی اللہ نے بغداد کو دوبارہ دارالخلافہ بنا لیا۔

موصل

یہ تاریخی شہر شمالی عراق میں دریائے دجلہ کے کنارے واقع ہے اور صوبہ نینویٰ کا دارالحکومت ہے۔ اس کے قریب اشوری دارالحکومت نینویٰ کے کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ 1127ء سے 1259ء تک موصل زنگی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ اس کے قریب عین زالہ میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ ہے۔

تاریخِ عراق کے 4 ادوار

① قدیم زمانے میں عراق بابل اور نینویٰ دو بادشاہتوں میں بٹا ہوا تھا حتی کہ چھٹی صدی ق م میں شاہ بابل بخت نصر نے نینویٰ پر قبضہ کر کے ملک کو متحد کیا۔

② 539ء ق م میں شاہ ایران کوروش کبیر (سائرس اعظم) نے بابل (عراق) فتح کر لیا۔ سائرس اعظم کو اسلامی مورخین ذوالقرنین قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد تقریباً 12 صدیوں تک عراق سلطنت فارس (ایران) میں شامل رہا۔

③ مسلمانوں نے 636ء میں عراق فتح کیا۔ پھر یہ اموی، عباسی، تاتاری (ایل خانی)، تیموری اور عثمانی سلطنتوں کا حصہ بنا رہا حتی کہ پہلی جنگ عظیم (18-1914) میں برطانیہ نے عراق پر قبضہ کر لیا۔ 1920ء میں انگریزوں کے ماتحت عراق میں شاہ فیصل اول کی بادشاہت قائم ہوئی جو کہ غدارِ ملت شریفِ مکہ حسین بن علی ہاشمی کا بیٹا تھا۔

④ موجودہ سرحدوں میں آزاد عراق 1932ء کے دوران وجود میں آیا جو 1958ء کے فوجی انقلاب کے بعد جمہوریہ بن گیا۔

عراق کے فوجی انقلابات

جولائی 1958ء میں جنرل عبدالکریم قاسم نے شاہ فیصل ثانی کا تختہ اُلٹ دیا۔ کنوارا شاہ اس انقلاب میں مارا گیا۔ اس کے عہد میں 1955ء میں پاکستان، عراق، ترکی، ایران، برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ معاہدہ بغداد میں شامل ہوا تھا۔ جنرل قاسم کی فوجی حکومت نے

عراق کو اس معاہدے سے نکال لیا۔ پھر اس معاہدے کا نام SEATO رکھا گیا اور اس کا نیا صدر دفتر انقرہ (ترکی) قرار پایا۔ 1963ء میں عراق میں پھر انقلاب برپا ہوا جس میں عبدالکریم قاسم مارے گئے اور ان کے سابق ساتھی عبدالسلام عارف برسرِ اقتدار آئے۔ چند سال بعد فضائی حادثے میں ان کی ہلاکت کے بعد ان کے بھائی عبدالرحمٰن عارف سربراہِ مملکت بنے۔ 1968ء کے انقلاب میں بعث پارٹی کے حسن البکر برسرِ اقتدار آئے جبکہ صدام حسین نائب صدر تھے۔ دس سال بعد صدام حسین نے حسن البکر کو چلتا کیا اور خود زمام حکومت سنبھال لی۔

عراق کی زمینی کیفیت

عراق کا بیشتر علاقہ میدانی و صحرائی ہے۔ شمال میں جبل سنجار ہے اور شمال مشرق میں ایران و ترکی سے متصل علاقہ بھی پہاڑی ہے۔ دریائے دجلہ کے معاون دریا زاب کبیر، زاب صغیر، عظیم اور دیالا ایران کے کوہستان زاغروس سے بہہ کر آتے ہیں۔ دجلہ اور فرات کے مابین شمال میں نشیب تر ثار ہے جبکہ وسط میں کئی نہریں فرات سے نکل کر دجلہ میں گرتی ہیں جن میں سے اہم نہریں کوثیٰ، نہر ملک اور نہر النیل ہیں۔ عراق کا مغربی علاقہ صحرائے ساوہ اور صحرائے شام میں پڑتا ہے۔ عراق کی بلند ترین چوٹی روست 3607 میٹر اونچی ہے جو ایرانی سرحد پر واقع ہے۔



ماہ جنوری کے درست جوابات

① راجح قول کے مطابق نبی ﷺ کی تاریخ پیدائش 9 ربیع الاول عام الفیل ہے۔
② ''عید میلاد النبی ﷺ'' اسلام میں ایک نئی عید ہے جس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔
③ نہ نبی ﷺ نے یہ عید منائی اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے۔
④ نبی ﷺ کا یوم وفات 12 ربیع الاول 11 ہجری ہے۔

بذریعہ قرعہ اندازی 6 ماہ کے لیے فری رسالہ پانے والوں کے نام

عائشہ حق (لاہور)، امۃ الرحمان (بھکر)، محمد سلیم (بدین)، حافظ دلشاد احمد (اوکاڑہ)، سفیر حسین، شہزاد علی (جھنگ)، امامہ نذیر (خانیوال)، قاری عبدالعزیز (حیدر آباد)، حافظ عثمان حیدر (گوجرانوالہ)، عمر فاروق خاں، محمد صہیب، عبدالعظیم عنبری (قصور)، حافظ معاویہ منیر (نارووال)۔

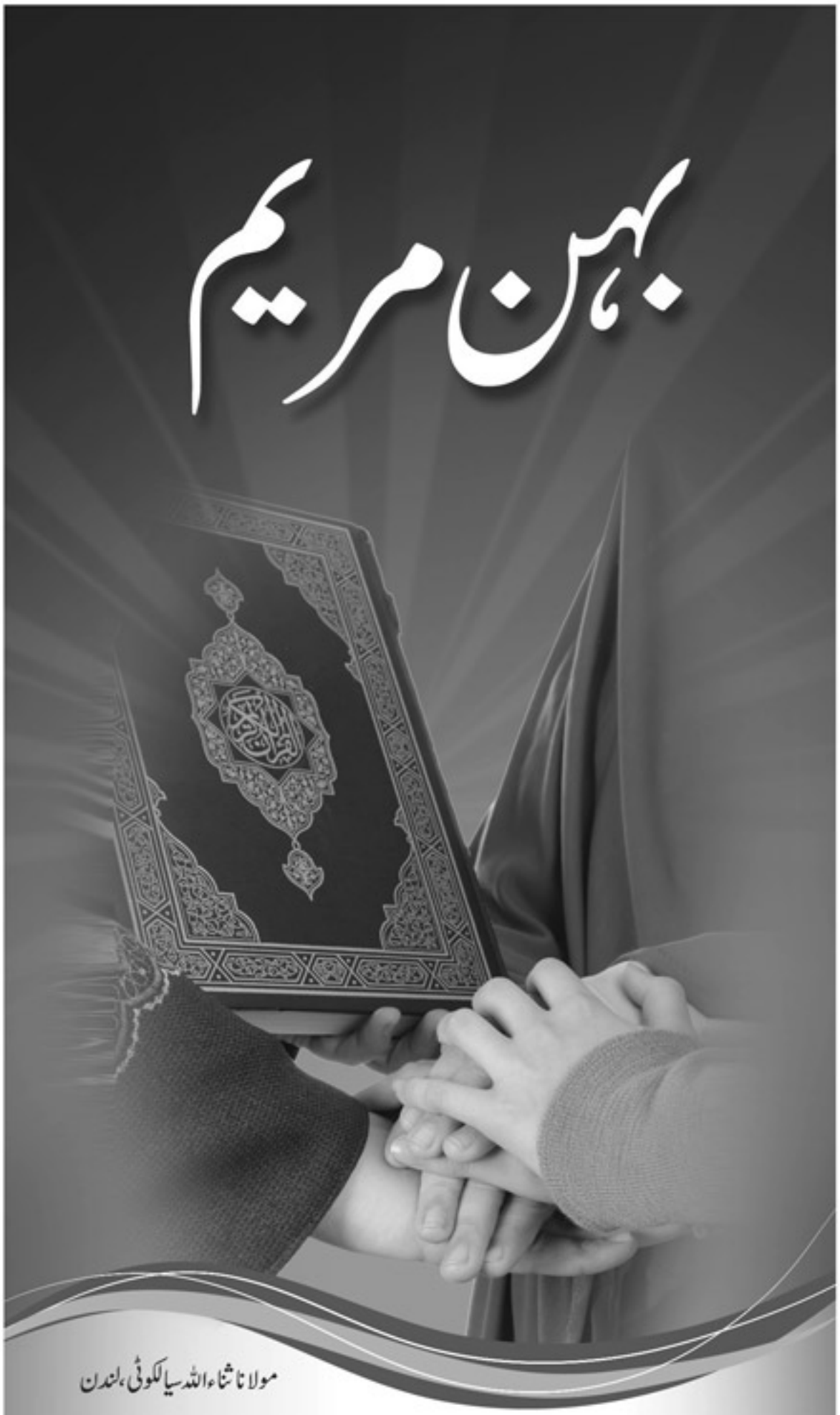
عبارتیں ڈھونڈیں انعام پائیں

① ''اللہ تعالیٰ تمھارے اور تمھاری بیوی کے رات کے عمل پر ہنس پڑا۔''
② ماضی قریب تک ایسی ''محبت'' کو باعث عار سمجھا جاتا تھا مگر اب اسے باعث افتخار سمجھا جانے لگا ہے۔
③ جب اس کی بیگم کسی غیر شخص کے ہمراہ گھر واپس لوٹی تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔
④ اب قرآن مجید کی بدولت تسلی اور اطمینان نصیب ہوا ہے۔

بچوں کے لیے انعامی کوئز

① یوم یکجہتی کشمیر کس تاریخ کو منایا جاتا ہے؟
② ''کشمیر'' پاکستان کا حصہ ہے یا بھارت کا؟
③ کیا مسلمانوں کو ''ویلنٹائن ڈے'' منانا چاہیے؟
④ معاشرے سے بے حیائی کے خاتمے میں آپ کیا کردار ادا کریں گے؟

(قرعہ اندازی میں شامل ہونے کے لیے جوابات کا ہر مہینے کی 20 تاریخ تک پہنچنا ضروری ہے۔)



مولانا ثناء اللہ سیالکوٹی، لندن

میں جانتی ہوں کہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے میڈیا سب کچھ کر رہا ہے

لندن میں ایک نومسلمہ بہن کے قبولِ اسلام کی داستان

35 سالہ ایک انگریز عورت ہمارے مکتبے پر آئی، اس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ کہنے لگی کہ اسلام کے تعلق سے مجھے کچھ کتابیں چاہئیں، ہم نے مختلف موضوعات پر اسے کتابیں دیں، دوران گفتگو اس سے پوچھ ہی لیا کہ کیا وہ مسلمان ہے؟ کہنے لگی: ''نہیں۔'' پوچھا: پھر اتنی کتابیں کیوں خرید رہی ہیں، کہنے لگی کہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرنے کی خواہش ہے۔ ہندوازم، بدھ ازم کی کتب پڑھی ہیں، مجھے تسلی نہیں ہوئی، دیکھنا چاہتی ہوں کہ اسلام کیا ہے؟ اسلام میں عورت کا کیا مقام ہے؟ اسلام نے عورت کو کیا حقوق دیے ہیں؟ خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریوں کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟ اس قسم کے اور کئی سوالات اس کے ذہن میں تھے۔ کتابیں خریدنے کے بعد کہنے لگی کہ مجھے اسلام کے بارے میں سستی کتب مل گئی ہیں جب کہ دیگر مذاہب کا مطالعہ کرنے کے لیے مجھے کافی پیسے خرچ کرنے پڑے ہیں۔

ایک ہفتے کے بعد یہی خاتون دوبارہ آئی اور کہنے لگی کہ مجھے اسلام کی تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق لگتی ہیں، جو کچھ میرے ذہن میں تھا، اسلام ایسے ہی بتاتا ہے۔ پھر جتنا اسلام نے عورت کا مقام بیان کیا ہے اس سے قبل کسی مذہب میں ایسا نہیں ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے بارے میں جھوٹا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ اسلام عورتوں پر ظلم و زیادتی کرتا ہے، ان کے حقوق غصب کرتا ہے، انھیں گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔ مکتبہ میں



ہمارے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا، جو سعودی عرب سے پڑھ کر آیا تھا، اس نے کہا کہ اسلام اچھا دین ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتی؟ چنانچہ اس نے اسی وقت کلمہ پڑھ لیا۔

چند ہفتوں کے بعد ایک برقع پوش خاتون آئیں، انھوں نے اونچی آواز میں السلام علیکم کہا۔ میں نے انھیں جواب دیا، کہنے لگیں: آپ مجھے پہچانتے نہیں؟ میں نے نفی میں جواب دیا، کہنے لگیں: میں وہی ہوں جو یہاں مسلمان ہوئی تھی، پھر اس نے بتایا کہ اس نے اپنا نام مریم رکھا ہے۔ اپنے بچوں کے نام بھی بڑے اچھے رکھے، ان کے لیے ٹوپیاں خریدیں۔ کہنے لگیں: ان کو مسجد میں بھیجتی ہوں، کوشش کرتی ہوں کہ قرآن مجید بھی پڑھوں، انگریزی ترجمہ کا سی ڈی، قرآن سیٹ لے گئیں۔ رومن رسم الخط میں لکھا ہوا قرآن مجید بھی خریدا اور کہنے لگیں کہ جب تک عربی نہیں پڑھ لیتی، یہی پڑھتی رہوں گی۔

پوچھنے پر اس خاتون نے بتایا کہ ماضی میں میرے گھر کے حالات بہت خراب تھے، دو بچے ہیں، خاوند چھوڑ کر چلا گیا، بچوں کو سنبھالنا، پھر کونسل کے آفس میں کام بھی کرنا، میرے لیے بڑا مشکل تھا۔ ایک الجزائری آدمی کے ساتھ شادی کی جو برائے نام مسلمان تھا، شراب تک پیتا تھا، گھریلو حالات سے اتنی افسردہ ہوئی کہ ایک دن خودکشی کا ارادہ کیا، پھر سوچا کہ اگر حالات سے تنگ آ کر میں خودکشی کرلوں گی تو ان بچوں کا کیا بنے گا۔ پھر میں نے مذہب کا سہارا لیا، مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا، یہی میرے اسلام لانے کا ذریعہ بن گیا۔

یہی بہن مریم چند دنوں کے بعد آئی تو حجاب اتارا ہوا ہے، پوچھنے پر کہنے لگیں کہ مجھے ایک پاکستانی بہن ملی تھی، اس نے بتایا کہ پردہ ضروری نہیں، نیز یہ تو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، اس لیے میں نے حجاب پہننا چھوڑ دیا۔ اس نے بتایا کہ پاکستانی عورتیں خصوصاً جو تعلیم یافتہ ہیں، وہ تو حجاب نہیں کرتیں، میں نے انھیں کچھ کتابیں حجاب کے موضوع پر دیں، پھر چند ہفتوں کے بعد آئی تو دیکھا کہ پورا حجاب ہے، سوائے آنکھوں کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں تھا۔ کہنے لگیں: میں بھٹک گئی تھی، قرآن مجید میں تو کئی مقام پر پردے کا حکم ہے، پھر امہات المومنین بھی پردہ کیا کرتی تھیں، اب کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ کہنے لگیں: مسلمان عورتیں بھی دین سے واقفیت نہیں رکھتیں۔

کافی مدت کے بعد پھر آئیں، کہنے لگیں: اللہ کا شکر ہے، دین پر قائم ہوں، حجاب کرتی ہوں، پھر انھوں نے چند کتب خریدیں، کہنے لگیں کہ مجھے ایسی کتب نہیں چاہئیں جو عقیدے کو خراب کرتی ہوں، مجھے صرف کتاب وسنت کی دعوت دینے والی کتب چاہئیں، پھر خود ہی کہنے لگیں کہ بدعات ورسومات کی تشہیر کرنے والی کتب نہ دینا۔ میں فلاں مسجد میں گئی ہوں وہ تو پیروں کو چومتے ہیں، مجھے صوفیوں کی کتابیں بھی نہیں چاہئیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ اسلام لانے سے پہلے کی زندگی اور اب کی زندگی میں کیا فرق محسوس ہوا ہے؟ کہنے لگیں کہ پہلے میں خودکشی کرنے لگی تھی، سوچتی تھی میری زندگی کا کیا مقصد ہے، کھانا پینا، سونا۔ انسان کس لیے دنیا میں آیا ہے، اب مطمئن ہوں۔ نماز ادا کرتی ہوں، دلی سکون ہوتا ہے، قرآن مجید ترجمہ کے ساتھ پڑھتی ہوں، پہلے لوگوں کے حالات معلوم ہوتے ہیں، انبیائے کرام کی کہانیاں پڑھ کر مطمئن ہو جاتی ہوں۔ اب زندگی کا مقصد واضح ہے کہ کس لیے دنیا میں آئے ہیں۔ اب قرآن مجید کی بدولت تسلی اور اطمینان نصیب ہوا ہے۔

میں جانتی ہوں کہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے میڈیا سب کچھ کر رہا ہے۔ بلکہ یہ لوگ جتنا بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی لوگ اسلام کے قریب آ رہے ہیں۔

دعا یا بددعا.....!!

ایک زاہد عابد شخص اپنے گیہوں پیسنے کے لیے چکی والے کے پاس گیا۔ چکی والا بولا: ''میں ابھی مصروف ہوں۔'' عابد نے کہا: ''تم یہ گیہوں ابھی کوٹ کر دو، ورنہ میں تمھارے، تمھارے گدھے اور تمھاری چکی کی بربادی کے لیے دعا کروں گا۔ چکی والا بولا: ''کیا تمھاری دعا قبول ہوتی ہے؟'' عابد نے کہا: ''ہاں۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہے تم اپنے گیہوں کے آٹا بن جانے کی دعا کرو۔ اس کا تمھیں فائدہ بھی ہے اور اس میں تمھارے دین کو نقصان بھی نہیں ہے۔'' چکی والے نے جواب دیا۔

(التذکرۃ الحمدونیۃ، ص:4653)